جلد ۱۰۲ جنوری ۱۹۸۵ء عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

موسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

سفینۂ نجات

از

مولانا جلیل احسن ندوی

کا نیا ایڈیشن

طبع ہو کر آگیا ہے تاجران کتب
اور قارئینِ کرام اپنی مطلوبہ تعداد
کے لیے پہلی فرصت میں اپنے
آرڈر سے مطلع فرمائیں۔

سائز ۲۳×۱۸/۸ خوبصورت کور

قیمت: ۲۸/۵۰ روپے

مولانا مودودی کے سیاسی افکار

از

عبدالکریم عابد

کا نیا ایڈیشن

طبع ہو کر آگیا ہے تاجران کتب
اور قارئینِ کرام اپنی مطلوبہ تعداد
کے لیے پہلی فرصت میں اپنے
آرڈر سے مطلع فرمائیں۔

سائز ۲۳×۱۸/۸ خوبصورت کور

قیمت: ۲۴/- روپے

اِدارۂ ترجمان القرآن لمیٹڈ۔ لاہور

رحمٰن مارکیٹ۔ غزنی سٹریٹ۔ اُردو بازار

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۰۲ | جنوری ۱۹۸۵ء مطابق ربیع الثانی ۱۴۰۵ھ | عدد ۵

اشارات:	جناب نعیم صدیقی صاحب	۲
حکمتِ سید مودودیؒ:		
نصرانیت سے مسیحیت تک	جناب عبدالہادی صاحب	۱۸
مقالات:		
قصیدہ بردہ شریف	جناب شاہ بلیغ الدین صاحب	۲۱
کتاب سازی و کتب خانہ سازی	جناب محمد حلیم چشتی صاحب	۲۶
میرے مشاہدات و تجربات	جناب سید اسعد گیلانی صاحب	۳۸
مادہ پرستانہ سائنس کی گواہی	مترجم: عبدالہادی صاحب	۴۸
مطبوعات:	(ادارہ)	۵۲

ماھنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور

بدل اشتراک
زرسالانہ تیس روپے - فی پرچہ / ۳ روپے

ت ح فا ... مودودی نے ایچ فاروقی ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اشارات

پاکستان کا دوسرا اور دنیا کا پانچ سو پچپنواں (۵۵۵) ریفرنڈم ۱۹ دسمبر ۱۹۸۴ء کو بخیر و خوبی منعقد ہوا اور خدا کا شکر ہے کہ عوام واضح مثبت نتیجے پر پہنچے۔

جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کو تو ہر جانب سے مبارکبادیں پہنچ رہی ہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اصل مبارک خود پاکستان کے لیے ہے جس کی فلاح و بہبود کی راہ کھلی۔ بعد ازاں تہنیت اس کے شہریوں کے لیے ہے جنہوں نے ۱۹۴۶ء والے جذبے کی یاد تازہ کرا دی۔

سے میں اپنے ان قریبی ہمسفرانِ مقصد سے بے حد متاثر ہوں جنہوں نے اجتماعیت کے فیصلے کے مقابلے میں ذاتی آرا و جذبات کو درکنار رکھ کر نہ صرف ریفرنڈم میں ووٹ دیئے بلکہ تگ و دو میں بھی کی نظامِ سمع و طاعت کے پابند یہی لوگ ہمارا اصل سرمایہ ہیں۔ اور انہی پر خدا کے بعد بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ راہِ حق میں ہماری قوت ہیں۔ میں آخرت میں بھی ان کے حق میں گواہی دوں گا کہ انہوں نے اجتماعیت کے احترام اور سربراہ کی اطاعت کا حق ادا کر دیا۔ خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ ان کو دنیا و آخرت میں بہترین جزا دے اور شہدائے حق کی صف میں شامل کرے۔ جس کسی سے کوتاہی ہوئی ہو وہ خدا سے بلجہ عفو طلبی کرے۔ اجتماعیت سے انحراف اور سربراہ کی اطاعت سے روگردانی شرعی طور پر گناہ ہے۔

مجھے ریفرنڈم کے اعلان پر چند پہلوؤں سے اُلجھن رہی، مثلاً یہ ریفرنڈم ہونا چاہیے تھا یا نہیں؟ اب ہونا چاہیے تھا یا اب سے بہت پہلے؟ اس کے سوال کا انداز کیا ہونا چاہیے تھا؟ آیا نظریہ پاکستان اور حکومت کے نفاذِ اسلام، قوانین کو کتاب و سنت میں ڈھالنے کی مساعی و اقدامات کے متعلق الگ اور جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کی ۵ سالہ صدارت کے لیے الگ، دو ریفرنڈم ہونے چاہئیں تھے؟ وغیرہ!

مگر احباب سے تبادلۂ خیالات کرنے اور ان کے دلائل سامنے آنے کے بعد، نیز ریفرنڈم کے سوال کا قانونی تجزیہ ہونے کے بعد ذہن آہستہ آہستہ یکسو ہو گیا اور پھر جب ہمسفرانِ جادۂ حق کا اجتماعی زاویۂ نگاہ نتھر کر سامنے آگیا تو چمکتے ہوئے چہروں نے مجھے بھی اطمینان کی روشنی دی۔ دِل ٹھک گیا کہ اس ریفرنڈم کو مثبت طور پر کامیابی سے ہمکنار ہونا چاہیے۔ اور ہم سب کو اس میں امکانی حد تک ہر جائز طریقہ سے حصہ لینا چاہیے۔ الحمدللہ کہ میرا دِل احباب کے کاروان کے لیے اور میرا کارواں کے لیے وفادار ہے۔ مَیں نے اپنی اہلیہ اور بیٹے سمیت ۵، ۶ میل کی دُوری پر جاکر اپنے ووٹ ڈلوائے اور دلی مسرت ہوئی کہ میں نے اپنا فرض خلوص سے ادا کیا۔ مجھے افسوس ہے اِس بات کا کہ علالت و ناتوانی کی وجہ سے مزید سرگرمی جو میدانِ عمل میں دکھائی جانی چاہیے، اس میں کوتاہ رہا۔ خدا اس کوتاہی کو معاف فرمائے۔

اس ریفرنڈم کی اہمیت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب عرض کرتا ہوں۔

پہلی اہمیت یہ ہے کہ مارشل لا کے نقطے سے نکل کر قوم کو سول جمہوری اور انتخابی حکومت کے دائرے میں داخل ہونے کا راستہ مل گیا ہے۔ انتخابات کو مؤخر کرنے کا اندیشہ اب اس وجہ سے نہیں ہے کہ صدرِ پاکستان کے آئندہ پانچ سالہ صدارت کا آغاز ہی منتخب ایوانوں کے اجلاس سے ہونا ہے۔ یہ واضح طور پر انتخابی گارنٹی ہے۔

دوسری اہمیت یہ ہے کہ اب تک جو کچھ کام ہوا تھا، نہ صرف اس کو عوامی ووٹوں

نے تحفظ فراہم کر دیا ہے بلکہ آئندہ ہونے والے انتخابات اور ان کے نتیجے میں قائم ہونے والی اسمبلیاں، ان سب کو آئینی ضمانت مل گئی ہے۔ اگر ایسی ضمانت کے بغیر انتخابات کرائے جاتے تو کل کوئی بھی شخص عدالت کے سامنے جا کر ان کو چیلنج کر سکتا تھا، پھر اگر یہ سارا عمل خلاف آئین قرار پاتا تو قوم ایک غیر محدود انتشار و تاریکی میں کھو جاتی۔ ریفرنڈم کے مثبت نتیجے نے ان خطرات کی راہ بند کر دی ہے۔

تیسری اہمیت یہ ہے کہ اس ریفرنڈم نے لادینیت پسندوں اور تخریب پسندوں کے اس محاذ کو شکست دے دی ہے جو موجودہ حکومت کے خلاف تو تھے ہی، ان کی پوری کوشش یہ تھی کہ آگے کے لیے جمہوریت کی بحالی اور انتخابات کے انعقاد کا راستہ روکا جائے تاکہ نئے مارشل لا کا انعقاد عمل میں آجائے۔ اور پھر وہ اس کی رکاب تھام کر اپنا اُلو سیدھا کر سکیں۔

چوتھی اہمیت یہ کہ نظریہ پاکستان اور نفاذِ اسلام کا جو سرمایہ تحریک پاکستان نے قوم کے لیے چھوڑا تھا، اس میں اسی قوم کے سیکولرسٹ لیڈروں نے یہ کہہ کر کیڑے ڈالنے شروع کر دیئے تھے کہ پاکستان کا تو مقصدِ وجود محض سیاسی و اقتصادی آزادی تھا، اس کا کوئی تعلق اسلامی قانون و حکومت سے نہ تھا۔ اس کے لیے وہ یہ کہتے رہے کہ قائد اعظم کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء والی (دستور ساز اسمبلی میں) تقریر اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ خود قائد اعظم کا منشا لادینی نظام تھا۔ انہیں یہ خیال نہ آیا کہ وہ قائد اعظم پر نہ صرف تناقض کا، بلکہ موقع پرستی کا ناپاک الزام بھی تھوپ رہے ہیں۔ پھر انہوں نے مقبولِ عام نعرے "پاکستان کا مطلب کیا — لا الٰہ الا اللہ" کی شانِ نزول یہ بیان کی کہ وہ تو بچوں کا نعرہ تھا۔ اِس سرپھرے پن کا جواب اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا تھا کہ نظریۂ پاکستان اور نفاذِ اسلام کے حق میں از سرِ نو بالغ شہریوں کے ووٹ ڈلوا کر دکھا دیا جائے کہ یہ نعرہ آج بھی بزرگوں، نوجوانوں اور خواتین کا دل پسند نعرہ ہے۔ یہ اچھا ہوا کہ ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۷ء کے قومی رجحانات کو قوم کے ذریعے تازہ کرا کے ایسے حضرات کے سامنے رکھ دیا گیا۔ آج ہر کوئی محسوس کر سکتا ہے کہ اصل بچے خود یہ بزرگ ہیں جنہوں

نے محض فاصلۂ وقت سے فائدہ اٹھا کر خلافِ حقیقت باتیں کہیں اور ساری قوم کو بچوں کا انبوہ سمجھ کر انہیں پھسلانا چاہا۔

سچ یہ ہے کہ کمیونسٹوں، لادینیت پسندوں اور تخریب کیشوں کی کمر اس فیصلے سے ٹوٹ گئی ہے۔

پانچویں اہمیت یہ ہے کہ روسی بھارتی لابی اور ان کے جاسوسی نظاموں اور آلہ ہائے کار کے خواب کرچی کرچی ہو گئے ہیں۔ اگر یہ ریفرنڈم نہ ہوتا تو روس اور بھارت دونوں کی خفیہ سرگرمیاں ہمارے ہاں کے آنے والے انتخابات کے خلاف شروع ہو جاتیں (جب کہ بھارت اپنے انتخابات سے فارغ ہو کر نئی قوت کے ساتھ پاکستان پر اپنی پرچھائیں ڈالنے کے لیے مصروفِ عمل ہو جاتا)۔

چھٹی اہمیت یہ ہے کہ آج ریفرنڈم نے پاکستانی قوت کے اسلامی جذبے اور وحدت کی قوتوں کو مجتمع کر کے پاکستان کو اس قابل کر دیا ہے کہ وہ اپنی داخلی اور خارجہ پالیسیوں کو آگے بڑھانے کے لیے مضبوطی سے کام کر سکے اور دنیا کی ہر قوت کے سامنے اعتماد سے کھڑا ہو سکے۔ نیز سرحدوں پر جو خطرات منڈلا رہے ہیں ان کو بھی اب ملحوظ رکھنا ہو گا کہ سامنے ایک ایسی قوت ہے جسے عوام کے ووٹوں نے اعتماد کی قوت دے چٹان بنا دیا ہے۔

ساتویں اہمیت یہ ہے کہ ریفرنڈم جس سوال پر ہوا ہے اس میں قانونی طور پر دو باتیں طے ہو گئیں۔ اوّل یہ کہ صدر کی ذمہ داری ہے کہ وہ قوانین کو کتاب و سنت کے سانچے میں ڈھالنے کا کام تیز تر کرے۔ اور دوم یہ کہ انتخابات کا انعقاد کرائے۔ اب اگر صدر اسلامی قانون سازی نہ کرے یا اس میں تاخیر و التوا سے کام لے یا قانون سازی میں کتاب و سنت کے اسلام سے انحراف کرے تو معاملہ عدالت کے سامنے لے جایا جا سکتا ہے کہ قوم نے ۵ سالہ صدارت جس متعین مقصد کے لیے دی تھی اسے صحیح طور پر پورا نہیں کیا جا رہا۔ اسی طرح اگر انتخابات کے انعقاد کرنے میں بے جا تاخیر ہو (جو بظاہر اس لیے ممکن نہیں کہ صدر کی صدارت کا آغاز ہی انتخابات کے بغیر نہیں ہو سکتا) تو یہ معاملہ بھی عدالت

میں لے جایا جا سکتا ہے کہ شہریوں نے تو ووٹ جلد انتخابات کرانے کے لیے دیئے ہیں۔ مارشل لا کے فیصلوں کو عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا ، مگر اب ریفرنڈم کا سوال ایک عوامی ، سیاسی اور قانونی حیثیت اختیار کر گیا ہے جس کے مضمرات پر عدالتوں میں بحث ہو سکتی ہے۔

جذباتی طور پر سوچنے والے حضرات ٹھنڈے دل سے ریفرنڈم کی ان اہمیتوں پر غور کریں۔ سیاست جذباتی ہیجانات سے نہیں چلا کرتی ، سیاست کے لیے فراست و تدبر کی ضرورت ہوتی ہے۔

کچھ لیڈروں اور شہریوں کی مشکل یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ذہنوں کی ساخت ایسی بنا لی ہے کہ اور سب کچھ گوارا ہے ، مگر جنرل محمد ضیاء الحق کا وجود کسی طرح گوارا نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ پہلے تو آپ غلام محمد گورنر جنرل ، سکندر مرزا ، صدر ایوب ، یحییٰ خاں ، بھٹو اور مجیب سب کے ساتھ جنرل محمد ضیاء الحق کو ایک قطار میں کھڑا کریں اور سب کو ان کے خیالات ، کردار اور کارکردگی کے لحاظ سے نمبر دیں اور پھر بتائیں کہ آپ کس نتیجے تک پہنچتے ہیں۔

فرض کیجیے کہ جنرل ضیاء الحق کو "۵" نمبر دیتے ہیں۔ اور اس لیے آپ نے ریفرنڈم کی مخالفت کی ہو گی یا بائیکاٹ کیا ہو گا۔ ذرا یہ فرمایئے کہ اگر ریفرنڈم کا نتیجہ خدانخواستہ اُلٹا ہوتا تو پھر کونسا ابراہیم لنکن یا امیرالمؤمنین یا آفتابِ تقویٰ سامنے آجاتا۔ پھر تو صدر ضیاء الحق بوریا بستر لپیٹتے اور کوئی دوسرا جنرل آچکا ہوتا اور وہ اب سے نئے اور نوجوان مارشل لا کو کسی اور ڈھب سے لے کے چلتا جسے سمجھنے اور جس کے ساتھ مناسبت پیدا کرنے سے پہلے جیسے "بھگتنا" بھی ہوتا اور ممکن ہے کہ اس پہلو سے تجربہ سابق تجربوں سے زیادہ تلخ ہوتا۔

اور فرض کیجیے کہ اہلِ سیاست کو پکارا جاتا کہ صاحبان آیئے اور نظام کو سنبھالیے۔ تب ذرا یہ فرمایئے کہ کیا دس بارہ یا زیادہ سیاسی (نیز دینی) افراد میں سمجھوتہ ہو بھی سکتا تھا؟ (چند سال کے تجربے کو سامنے رکھیے!) اور ہوتا تو کس شخصیت پر ہوتا۔ میں کسی کا نام نہیں لیتا۔ کیونکہ اس سے خواہ مخواہ کا ردِّعمل پیدا ہو سکتا ہے۔ آپ سارے بڑے ناموں کی فہرست بنایئے اور غور کیجیے کہ کس پر سمجھوتہ ہو سکتا تھا۔ اور پھر اس سے آپ کو دینی اور ملکی لحاظ سے کیا ملتا؟

یہ کوئی سیاست نہیں ہے کہ ایک شخص کو آپ میخ بنا کر ذہن میں گاڑ لیں اور یہ کہیں کہ جب تک یہ میخ نہیں نکلتی، نہ ہم انتخاب لڑیں گے اور نہ قوم یا ووٹروں کے کسی فیصلے کو قبول کریں گے۔ بائیکاٹ کسی خاص موقع پر کسی جلسے یا تقریب یا کانفرنس کا ہو سکتا ہے، لیکن اگر خود بائیکاٹ ہی ایک مسلک بن جائے تو پھر آپ سیاست کا کوچہ چھوڑ کر کوئی دوسرا بازار ڈھونڈیے۔ بائیکاٹ منفی راستہ ہے، سیاست میں منفی راستے پر زیادہ دُور تک نہیں چلا جا سکتا۔ منفیت دوسروں کو تو ختم کرے یا نہیں، خود اپنی قوتوں کو چاٹ جاتی ہے۔

کیا رحم طلب ہیں وہ سیاسی شخصیتیں اور گروہ جو ریفرنڈم سے پہلے بھی دل کا غبار نکالتے رہے اور جب اُن کے روکے ریفرنڈم کی گاڑی نہ رُکی تو انھوں نے سانپ کے نکل جانے کے بعد لکیر کو پیٹنا شروع کر دیا۔ اخباروں کے کالموں اور نجی گفتگوؤں اور اخباری بیانوں میں ـــــ یہاں سے لے کر بی بی سی، آکاش وانی اور ماسکو ریڈیو تک ـــــ جابجا لکیر کو پیٹا جا رہا ہے۔ جو حضرات پولنگ اسٹیشنوں پر اُلّو بولنے کی پیش گوئی کر رہے تھے، انھوں نے جب سیکڑوں جگہ پاکستانی شاہبازوں کی صفیریں سُنیں تو ان کے اپنے دل و دماغ میں اُلّو بولنے لگا۔ آج کوئی کہتا ہے کہ پولنگ ۱۵، ۲۰٪ ہوئی اور کسی کا زائچہ بتاتا ہے کہ ۵٪ ہوئی۔ دوسرا بتاتا ہے کہ جعلی ووٹ بے تحاشا بھگتائے گئے۔ سوال یہ ہے کہ اگر آپ ریفرنڈم کو ناکام بنانا چاہتے تھے تو شہری ذمہ داریوں کے

نحست جرأت کر کے آپ نے اپنے لوگوں سمیت جا کر "نہیں" کا ووٹ کیوں نہ ڈالا؟ اس طرح دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جاتا۔

آج جو لوگ ہیر پھیر کر کے ریفرنڈم کے مثبت نتیجے کے دودھ میں مینگنیاں ڈال رہے ہیں، انہیں اس شغل فضول کو چھوڑ کر کوئی دوسرا نیک کام کرنا چاہیے۔

یہ طریقہ ملک کے سیاسی مزاج کو بگاڑنے والا ہے کہ پہلے آپ یہ زور لگائیں کہ ریفرنڈم نہ کرایا جائے۔ پھر آپ بائیکاٹ کر کے پولنگ اسٹیشنوں پر اُلو بولوانا چاہیں، پھر جب سب کچھ ہو جائے تو فرمائیں کہ ہم نہیں مانتے۔

"میں نہ مانوں" کا اگر یہی طور سیاست کی ادا ٹھہرے تو جو کام آپ کرنا چاہیں اور اپنے گروہوں کو جن مقاصد سے بلائیں اور پبلک سے جو اپیل کریں اس پر متعلقہ لوگ "میں نہ مانوں" کہہ کر سامان انتشار کیوں نہ کریں؟ "میں نہ مانوں" کا راستہ انتشار کا راستہ ہے۔ آخر معاملات کو کسی نہ کسی طریقے سے، کسی نہ کسی نقطے پر آ کر ختم ہونا ہوتا ہے۔ جس ملک و قوم میں نزاعات کا کوئی اختتام نہ ہو، اس کے مقدر میں خرابی کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔

اب پیچھے پلٹنے یا بیٹھ رہنے کے بجائے اگلے مرحلے پر سوچ بچار کرنی چاہیے۔ اگلا مرحلہ انتخابات کا ہے۔

کچھ لوگ تو وہ ہیں جنہوں نے طے کر رکھا ہے کہ جنرل ضیاء الحق کے ماتحت اگر انتخابات ہوں تو وہ ان میں شریک نہیں ہوں گے۔ ان کا [illegible] ایسی ہے جیسی ہمارے دیہی علاقوں میں [illegible] ہوں، لیکن اگر [illegible] نعوذ باللہ [illegible] بس ان [illegible] [illegible] سے آراستہ شہری ہیں۔

جنرل ضیاء الحق نے انتخابات کے سلسلے میں میاں طفیل محمد صاحب کی پیش کردہ شرائط پر جو وضاحتیں اور یقین دہانیاں دوران ملاقات کرائی تھیں اور پھر جن کو پریس اور اسٹیج کے ذریعے بھی عوام کے سامنے رکھ دیا، ان کے متعلق مجھے بڑی حد تک یقین ہے کہ وہ اپنے ایک ایک لفظ کا پاس کریں گے، اور نہ کریں گے تو پھر ہم کو معلوم ہے کہ ہمارا فرض کیا ہے اور اسے ہمیں کس اسلوب سے ادا کرنا ہے۔ لیکن بلاوجہ مخالفانہ پیش قیاسیاں کرنے کی وجہ سے فضا خراب ہوتی ہے۔

اب اگر دستور ۱۹۷۳ء کو برقرار رکھ کر، معقول طریق سے انتخابات کر دیئے جاتے ہیں اور پارلیمان کو بااختیار ادارہ بنایا جاتا ہے، وزیر اعظم کی بااختیار حیثیت بحال کی جاتی ہے، نیز سول سروس کے طے شدہ حقوق و اختیارات کو برقرار رکھا جاتا ہے اور مزید یہ کہ قرارداد مقاصد کو دستور کے دیباچے کے بجائے اس کا عملی حصہ بنا کر قوانینِ اسلام کے اجراء اور اسلامی اداروں کے قیام اور ان کے نشوونما اور پالیسیوں کو اسلامی اصول و مقاصد کے مطابق ڈھالنے کے تیز رفتار عمل کی یقین دہانی کرائی جاتی ہے تو پہلے سے شکوک وشبہات سے بات کا آغاز نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ مذکورہ اعلانات و مواعید کو خوش آئند قرار دے کر عوام کو متحرک کرنا چاہیے۔

خاص طور پر جن لوگوں کو جمہوریت کی بحالی کے ساتھ دین کے لیے کام کرنا ہے، ان کو پیش آمدہ فرائض کے لیے آج سے عملی سرگرمی کی راہ پر گامزن ہو جانا چاہیے، بلکہ صحیح الفکر وہ لوگ نکلے جنہوں نے ریفرنڈم میں پبلک اور پولنگ کے عملے کے درمیان کام کر کے انتخابات کی راہ پر قدم آگے بڑھا دیا ہے۔

؎ یہ بات بالتصور ہی غلط تھا کہ ریفرنڈم میں جو کارکن ووٹروں کو صحیح تلقین کریں، یا ان کی رہنمائی اور مدد کریں، یا پولنگ اسٹیشنوں پر پہرہ دیں وہ ضیاء الحق کے کارکن بن گئے۔ وہی بات کہ بعض ذہنوں میں ضیاء الحق مبتلا بن کر رہ گیا ہے، اچھی نہیں۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

امین و ذہین قسم کے لیڈروں اور شہریوں کی خواہش اور کوشش یہی ہونی چاہیے کہ انتخابات اسی اعلان شدہ نقشے کے مطابق منعقد ہوں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

مگر فرض کیجیے جو معیاری تصور آپ کا ہے اس میں کوئی کسر رہ جائے تو یہ سوال جواب مانگتا ہے کہ پھر کیا کیا جائے۔ اس کا ایک آسان جواب تو یہ ہے کہ مخالفت (بلا تصادم) کے ساتھ بائیکاٹ۔ مگر یہ جواب درست نہیں ہے۔

اگر برسر اقتدار قوت اپنی بات سے انحراف کرے یا شہریوں کی خواہشات یا اسلامی اور جمہوری روایات سے روگردانی کرے تو سخت اعتراض بھی کیجیے اور غلط روش کے خلاف احتجاج کی آواز بھی اُٹھائیے۔ (اگر ممکن ہو!) لیکن ایسا بائیکاٹ بہت بے معنی ہے جو کسی فرد یا گروہ کے سیاسی اقدام کو برسوں کے لیے معطل کر دے، یہاں تک کہ اس کا سیاسی شعور اور سیاسی مزاج ہی دم توڑ دے۔

سیاست کا ایک اُصول یہ ہے کہ سیاست کاری کسی درپیش صورت حال GIVEN CIRCUMSTANCES کو موجود مان کر اپنے عمل کو جاری رکھنے کا نام ہے۔ فرض کیجیے کہ مسافرِ سیاست کے سامنے ایک طویل و عریض جنگل آجاتا ہے اور وہ اُسے دیکھ کر کہتا ہے کہ جب تک یہ جنگل کٹے گا نہیں اور صاف ہموار میدان نہ بن جائے گا، میں قدم آگے نہ بڑھاؤں گا۔ پھر وہ اطمینان سے کھیت میں اپنا کیمپ لگا لیتا ہے۔ یہ سیاسی طرزِ عمل نہیں ہے۔ سیاسی طرزِ عمل یہ ہے کہ اگر جنگل سامنے آجائے تو ہمیں اسی میں سے اپنا راستہ نکالنا ہے، کسی بیل کو نوچ کر، کسی شاخ کو توڑ کر، کسی جھاڑی کو الانگ کر، کسی نالے پر پڑی سی سوکھی لکڑی سے پُل بنا کر، سیدھا نہیں تو ذرا اِدھر اُدھر گھوم کر، ہجوم کر کے نہیں تو ایک قطار بنا کر

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

وہ اپنے مقصد کے کارکن بنے اور انہوں نے اپنے مقصد کے لیے انتخابی راستے میں پیش قدمی کی۔ جنہوں نے کوتاہی کی، اب جب وہ لیکایک اپنے لیے ووٹ مانگنے جائیں گے تو اُن کو خود محسوس ہو جائے گا کہ انہوں نے ریفرنڈم کے مرحلے کا کام نہ کر کے اپنا نقصان کیا۔

جنگل کا سینہ چیر جانا ہے۔

یہی اُصول تھا جس کے تحت خان لیاقت علی خان مرحوم کے دَور کے اُن انتخابات میں ہم نے حصّہ لیا جن میں سرکاری ملازمین پہلی بار زور شور سے استعمال ہوئے اور دھن، دھونس اور دھاندلی کے مختلف طریقے استعمال کیے گئے۔ پھر ایوب خان صاحب کی بنیادی جمہوریت جس کی شدید مخالفت مولانا مودودیؒ اور ان کے متاثرین نے کی، (اور اس دَور میں زیادتیاں بھی برداشت کیں) اسی کے تحت ہونے والے انتخابات میں مولانا مودودیؒ کی رضامندی (بلکہ تقاضے سے) بہت سے محبانِ دین و جمہوریت نے پوری طرح حصّہ لیا[1] جن میں سے ایک میں بھی تھا۔ پھر یحییٰ خان کے مارشل لا کے تحت اور بعد ازاں بھٹو آمریت کے تحت ہونے والے انتخابات میں بھی ہم شریک ہوئے۔ بعد ازاں موجودہ مارشل لا کے تحت بلدیاتی انتخابات میں بھی ہمارے دوست بڑی تعداد میں شریک ہوئے اور بہت سے کامیاب ہوئے۔

یہ سب کچھ اگر جائز تھا، تو آج جو انتخابات درپیش ہیں، ان میں اگر کوئی کمی بیشی رہنی بھی ہے تو اس کے باوجود ہمیں تو یہ سوچنا چاہیے کہ ہم کس طرح اپنا راستہ بنا کر نقشۂ سیاست میں بہتر تبدیلی کی کوشش کر سکتے ہیں اور غلبۂ دین کے لیے کس حد تک اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

---

(۲)

کوئی بھی اجتماعیت اس حقیقت کو نظر انداز کر کے قائم نہیں کی جا سکتی، چاہے وہ مسجد کمیٹی ہو یا پارلیمنٹ، یا ریاست کہ افرادِ انسانی میں مختلف مسائل و معاملات کے

[1] صدارتی الیکشن ہوا تو اس میں بھی ہم نے حصّہ لیا۔

بارے میں اختلاف ضرور ہوتے ہیں۔ اسی لیے ہر معقول اجتماعیت وہ طریقہ بھی متعین کرتی ہے جس کے تحت تمام اختلافات کسی ایک خط پر آکر ختم ہو جاتے ہیں، یا اگر عقلی حد تک رہیں بھی تو وہ عملی کام میں حائل نہیں ہوتے۔

اسلامی اجتماعیت نے اختلافات کے بارے میں یہ طریقہ وضع کیا ہے۔

اوّلین معیارِ فیصلہ چونکہ یہاں الکتاب اور الرسول ہے، اس وجہ سے جو امور صراحۃً کتاب وسنّت کے نصوص سے ثابت ہوں، ان میں کسی کو اختلاف کرنے کا حق نہیں۔ ایسے معاملات میں صرف آمنا وصدقنا کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ منصوص معاملات و مسائل میں اگر راہیں الگ الگ ہو جائیں اور ہر شخص کی تقسیمِ حلال وحرام اور تمیزِ جائز و ناجائز جدا جدا ہو تو کسی اجتماعیت کے قائم رہنے یا چلنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہاں، نصوص کی تعبیرات اور ان کے انطباقات میں نقطۂ ہائے کا فرق ہو سکتا ہے۔ یہ فرق اہلِ علم سلف کے قابلِ احترام واعتماد مفسرین ومحدثین اور فقہا کی تحقیقات کی مدد سے یہ دلائل واضح کر کے نقطۂ اتفاق پیدا کر سکتے ہیں۔ بیشتر معاملات میں اجماع اور قرونِ اُولیٰ سے اب تک کا یکساں تعاملِ اُمت فیصلہ کن ہوتا ہے۔ پھر بھی اگر تعبیر وتاویل کے جزئی اختلافات رہیں تو وہ اگلی قسم کے مسائل کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔

اسلامی اجتماعیت کا اصل دائرۂ اختلاف تدابیر ومصالح سے تعلق رکھتا ہے۔ کب کیا بات کہی جائے؟ کیا اقدام مناسب ہوگا؟ کس رویّے میں دین کی خیرخواہی اور ملّت کی بہبود یا انسانیت کی فلاح ہے؟ کس صورت میں تحریکِ اسلامی کا چہرہ زیادہ روشن ہو سکتا ہے؟ کس رُخ پر چلنے سے دعوتِ حق کی راہیں کھلتی اور آسان ہوتی ہیں؟ کس چیلنج کا کیا جواب دینا مناسب ہوگا؟ کس شخص یا گروہ کے بارے میں کیا رائے رکھی اور بیان کی جائے؟ اُلجھنوں کے جنگل میں سے کیسے راستہ بنانا مناسب ہوگا؟ کس شکل میں اجتماعیت کی زیادہ قوت مجتمع ہو سکتی ہے اور وحدت کی صف مضبوط ہو سکتی ہے وغیرہ

اختلافی اُمور کی اسی دوسری صنف میں تعبیرِ نصوص یا انطباقاتِ احکام کا ہر وہ معاملہ بھی داخل ہو جائے گا جس کا حل اجماع یا تعاملِ اُمت یا علمائے سلف کی کاوشوں سے نہ ہو سکے۔ اس ذیل کے اختلافی اُمور کے لیے اُصولِ مشاورت مقرر کیا گیا ہے جس کے بعد اور کوئی طریقۂ حلِ اختلافات موجود نہیں ہے۔ یہاں آکر تمام بحثوں کو ختم ہو جانا چاہیئے۔

اسلامی مشاورت کے اساسی ضوابط حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ اہم مسائل و معاملات کو اُولی الامر (اربابِ مشاورت اور صاحبِ امر) کے حوالے کرنا چاہیے۔ یعنی پہلے سے اس پر ایسی کھلی بحثیں ہونی چاہئیں کہ مختلف افراد اور گروہوں کے اندر حتمی آرا تشکیل پا جائیں، نہ کسی ایک یا دوسرے نقطۂ نظر پر گروپ یا جتھے بن جانے چاہئیں، بلکہ گفتگوئیں محض مسئلے کو سمجھنے کے لیے ہوں اور کوئی آدمی کسی خاص رائے کو نہ تو حتمی فیصلے کے طور پر پیش کرے، نہ ایسے فیصلے کے حق میں نجویٰ CONVESSING کر کے فضا ہموار کرے اور نہ ہم خیالوں کا جتھا بنائے۔

۲۔ جس سطح پر رائے طلب کی جائے، وہاں ہر شخص دیانت داری سے اپنی رائے دے (بلاخوف لومۃ لائم) کیونکہ کسی شخص کے اندر جو رائے بھی مفادِ دین اور مصلحتِ مسلمین اور خیر خواہیٔ انسانیت کے لیے پیدا ہو وہ ایک امانت ہے جو دیانت داری سے ادا کرنی چاہیے۔ اپنی رائے کے حق میں پورے دلائل دیے جائیں۔ امکانی اعتراضات اور مقابل کے شبہات کے بارے میں وضاحتیں کی جائیں۔ پھر جب آدمی یہ حق ادا کر لے تو وہ اپنی بڑی ذمہ داری سے فارغ ہوا۔ اب یہ کام متعلقہ فرد، افراد یا مجلس کا ہے کہ وہ کشادہ دلی سے غور کریں اور استفادہ کریں۔

۳۔ کسی شخص کو اپنے متعلق عقلِ کل ہونے کا ادعا اور دوسروں کے مقابلے میں ذہنی برتری کا احساس لاحق نہیں ہونا چاہیے کہ بس جو کچھ میں نے کہا ہے اُسے ضرور مانا جانا چاہیے۔ دوسروں کو بھی حسنِ نیت سے آراستہ سمجھنا چاہیے اور تسلیم کرنا چاہیے کہ دوسرے

بھی سوچتے ہیں، دوسروں کے اندر بھی اپنی اپنی آراء ابھرتی ہیں، دوسروں کے دلائل بھی قابلِ توجہ ہوتے ہیں۔ اور دوسروں سے بھی استفادہ کیا جانا چاہیے۔

۴:- پھر جب ہر طرف سے آراء سامنے آچکیں تو کسی دینی مشاورتی مجلس کی فضا جو رنگ اختیار کرے اور ساری مجلس یا اس کی واضح اکثریت جب کسی فیصلے پہ پہنچ جائے تو اجتماعی نقطۂ نظر کو اس کشادہ دلی سے قبول کر لینا چاہیے کہ جیسے وہ بھی اپنا ہی فیصلہ ہو۔ ذہن میں اگر کوئی اختلافی رجحان باقی بھی رہے تو اُسے اجتماعیت پر قربان کر دینا چاہیے۔ علی الخصوص جب سربراہِ کار کی رائے بھی اکثریتی رجحان کے حق میں دو ٹوک طریق سے سامنے آجائے تو پھر سمع و طاعت اور ہم آہنگی کی ذمہ داری اور بھی شدید ہو جاتی ہے۔ اسلامی اُصولِ مشاورت کے تحت کسی شخص کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اجتماعی فیصلہ ہو جانے کے بعد پھر اپنی جداگانہ اختلافی رائے کا جھنڈا بلند کرے بلکہ یہ بھی درست نہیں کہ اس کے الفاظ یا رویے سے کسی طرح کے تکدر اور بددلی کا اظہار ہو۔

یہ ہے طریقہ تفردات کے فتنے سے بچ کر اجتماعیت کو مستحکم رکھنے کا۔ اگر حلِ اختلافات کے لیے ایسی کوئی آخری حد معین نہ کی جائے تو پھر آدمی کی اختلاف پسند فطرت نہ کسی اتحاد کو قائم رہنے دیتی ہے، نہ کسی اجتماعیت کو چلنے دیتی ہے۔

یہی تمام مخلص خادمانِ دین کی روش رہی ہے، یہی اسلامی نظامِ جماعت کے دستور کا تقاضا ہے۔ اور یہی ۴۳ سال سے ہماری اٹل روایت رہی ہے۔

اس اصول و روایت میں خلل ڈالنے کے معنی یہ ہیں کہ ہزاروں افراد کی قربانیوں سے اسلامیت کے قلعے کی جو فصیل اُٹھائی گئی تھی، اس میں دراڑیں ڈال دی جائیں، اور ساتھ اپنی بنی بنائی ساکھ کو برباد کر دیا جائے۔ محض اپنی "انا" کے سامنے اتنا قیمتی چڑھاوا پیش کر دینا کوئی اچھی بات نہیں۔

یہ محض خود ساختہ مصلحتی باتیں نہیں ہیں، بلکہ معاملے کے ہر پہلو پر الگ الگ دلائل

کتاب وسنت میں موجود ہیں۔ ان سارے دلائل کو جو شاید بیشتر نگاہوں سے اوجھل نہیں ہیں، میں یہاں دوہرانا نہیں چاہتا۔ لیکن اسلامی نظامِ سمع وطاعت کے متعلق متعدد ہم معنی احادیث میں سے صرف ایک کو یہاں نقل کرتا ہوں:

عن جُنادة بن ابی امیه، قال: دخلنا علی عُبادةَ بن صامت وهُوَ مریضٌ، فقلنا حَدِّثْنا اَصلحکَ اللّٰه بحدیثٍ یَنفعُ اللّٰه بِهٖ سَمِعْتَهُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلّی اللّٰه علیه وَسلّم، قال: دعانا رسولُ اللّٰهِ صلّی اللّٰه علیه وسلّم فبایعنا، فکانَ فِیْمَا اَخَذَ علینا اَنْ بَایَعْنَا علی السمعِ وَالطاعة فی مَنْشَطِنَا وَمَکْرَهِنَا وَعُسْرِنَا وَیُسْرِنَا وَاَثَرَةٍ عَلَیْنَا، وَلَا نُنَازِعُ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ، قَالَ اِلَّا اَنْ تَرَوا کُفْرًا بواحًا عِنْدَکُمْ مِنَ اللّٰهِ فِیْه بُرهانٌ (مسلم)

ترجمہ: "روایت جنادہ بن امیہ کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم عبادہ بن صامت کے پاس گئے جو حالتِ مرض میں تھے، پھر ان سے ہم نے کہا کہ اللہ آپ کو شفا دے، ہم سے کوئی حدیث بیان کیجیے۔ جو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو اور اللہ اسے باعثِ افادہ بنا دے۔ انہوں نے (جواباً) کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں (بیعت کرنے کے لیے) فرمایا اور ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے جو اقرار لیا اور جس پر ہم نے بیعت کی وہ یہ بات تھی کہ ہم سمع وطاعت کے پابند رہیں، پسندیدہ صورتوں میں بھی اور ناپسندیدہ صورتوں میں بھی، آسانی کی حالت میں بھی اور تنگی کی حالت میں بھی —— اور اس صورت میں بھی کہ ہم دباؤ میں ہوں، اور یہ کہ ہم اختیار کے معاملے میں اہلِ اختیار سے نزاع نہ کریں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اضافہ فرمایا کہ " اِلَّا یہ کہ تم صریح و نمایاں کفر کے صدور کو دیکھو، جس کے متعلق تمہارے پاس اللہ کی طرف سے واضح دلیل موجود ہو۔"

اِس حدیث کو پڑھ کر یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ کسی صحیح دینی اجتماعیت کا معاملہ

عام سیاسی پارٹیوں کی طرح کا نہیں ہوتا، جو چیز چاہی مان لی، جس معاملے میں چاہا اختلاف کر کے الگ بیٹھ رہے، دوسروں میں اپنا اختلافی نقطۂ نظر پھیلانا شروع کر دیا، بات کو پریس میں لا کر "المجالس بالامانۃ" کی تعلیم کو پامال کر دیا۔ دینی اجتماعیت کے نظامِ امر اور نظامِ مشاورت اور حدودِ اختلاف کی خلاف ورزی گناہ ہے جس کے سرزد ہونے کے بعد توبہ کے علاوہ کوئی راہ نجات نہیں۔

اس حدیث (اور ایسی متعدد احادیث) کا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی فیصلوں اور اربابِ امر کے احکام کی اطاعت خوشگواری اور ناخوشگواری، آسانی اور تنگی کی مختلف حالتوں میں کی جائے گی، بلکہ آدمی جب محسوس کرتا ہو کہ اس کی بہ خلوص رائے اور اس کا محکم استدلال دوسروں کی کثرت رائے یا صاحبِ امر کے نقطۂ نظر کے بوجھ سے دَب گیا ہے، تب بھی اُسے اطاعت کرنی چاہیے ___ اور ایسا نہیں ہونے دینا چاہیے کہ اس کے رویّے، اس کے الفاظ، اس کے لہجے یا چہرے کے رنگ سے بھی دیکھنے والوں کو یہ تاثر ہو کہ اس شخص کو اجتماعی فیصلے یا صاحبِ امر کے حکم سے کوئی تکدر ہے۔

دوسری اہم بات اس میں یہ ہے کہ اہلِ امر سے اختیار چھیننے یا اس اختیار کو کمزور کرنے یا اسے کم اثر بنانے کے لیے بحثا بحثی اور شدتِ اختلاف اور اظہارِ رنج اور جتھا بندی کے ذریعے شمہ بھر بھی کوشش نہ کی جائے۔ جو لوگ شریکِ مشورت ہوتے ہیں وہ بھی "امر" سے ایک گونہ تعلق رکھتے ہیں، لہٰذا ان کی اکثریت کے رجحان کو بے وزن اور ناقابلِ احترام قرار دینا بھی تنازع کی تعریف میں داخل ہے۔ اور سربراہ جو کسی اسلامی نظامِ جماعت کو چلانے کی آخری ذمہ داری رکھتا ہے اور پوری جماعت کے سامنے سب سے بڑھ کر جواب دہ ہوتا ہے۔ وہ جب رفقائے مشورت کی بحثیں سُن کر ان کے غالب رجحان کی بنیاد پر ایک فیصلہ دیتا ہے کہ یہ بات یوں طے ہوئی تو اس بات کو نہ ماننا یا زبان سے مان کر عمل سے اس کا حق ادا نہ کرنا، یا مثبت سرگرمی کے بجائے منفی انداز سے ذہنی برودت کا مظاہرہ کرنا۔ یہ ساری صورتیں نزاع فی الامر کا شائبہ رکھتی ہیں۔

آخری بات یہ ہے کہ حدیث کی رو سے بگڑ جانے یا نبری کرنے یا مختلف رائے سامنے لانے کے لیے صرف ایک ہی حتمی بنیاد ہے، اور وہ یہ کہ کھلے کھلے کفر کا صدور اصحاب امر یا ارباب مشورت کی طرف سے ہو، اور کھلے کھلے کفر کا اطلاق محض جذبات کی بنیاد پر نہ کیا جائے۔ بلکہ آدمی کے پاس اللہ کی طرف سے صاف صریح دلیل ہونی چاہیے۔

یہ ہے کسی اسلامی نظام جماعت میں طاعت کی آخری حد۔ اگر لوگ اس آخری حد کے آنے سے پہلے ہی ہر اختلاف پر ادھر اُدھر منہ پھیر لیں تو نتیجہ سوائے اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ ایک تیز رو ندی جو چٹانوں کو ریلتی جاتی ہو، کئی دھاروں میں تقسیم ہو جائے اور چھوٹے چھوٹے دھارے اس قابل بھی نہ ہوں کہ راستے میں جمع ہو جانے والے انبار خس و خاشاک کو بہا لے جا سکیں۔ وہی ندی جسے عبور کرنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ اب اس کے چھوٹے چھوٹے دھاروں اور باریک باریک نالیوں کو بچے بھی الانگنے لگیں گے۔ اختلاف جب اپنی حدود کا پابند نہ رہے تو پھر اجتماعیت کا قائم رہنا ممکن نہیں رہتا۔ سمع و طاعت کے دینی اصولوں اور دیرینہ عملی روایات کو اگر توڑا جانے لگے تو پھر کسی فرد کی بھی سربراہی اور کسی مجلس کی مشاورت کی قوت کام نہ کر سکے گی۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم شریعت کے نظام سمع و طاعت، اس کے ضابطہ مشاورت اور اولی الامر کے حقوق کو اچھی طرح سمجھیں اور ان کو قدم قدم پر ملحوظ رکھیں۔

حکمتِ سیّد مودودیؒ

نصرانیت سے مسیحیت تک

اخذ و اقتباس کردہ:- جناب عبدالهادی صاحب

(کرسمس کے موقع کی مناسبت سے یہ اقتباسات شائع کیے جا رہے ہیں۔ شاید ہمارے عیسائی بھائی ان پر غور کریں)۔

قرآن مجید نے مسیح کے ماننے والوں کو مسیحی یا عیسائی کے نام سے یاد نہیں کیا، بلکہ انہیں یاد دلایا ہے کہ تم دراصل ان لوگوں کے نام لیوا ہو جنہیں عیسیٰ ابن مریم نے پکارا تھا کہ مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ "کون ہے جو اللہ کی راہ میں میری مدد کرے"؟ اور انہوں نے جواب دیا تھا کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ "ہم اللہ کی راہ میں مددگار ہیں"۔ اس لیے تم اپنی ابتدائی اور بنیادی حقیقت کے اعتبار سے نصاریٰ یا انصار ہو۔ لیکن آج عیسائی مشنری اس یاددہانی پر قرآن کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے اُلٹی شکایت کر رہے ہیں کہ قرآن نے اُن کو مسیحی کہنے کے بجائے نصاریٰ کے نام سے کیوں موسوم کیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی پیروآپ کو صرف نبی مانتے تھے، موسوی شریعت کا اتباع کرتے تھے، عقائد اور احکام اور عبادات کے معاملہ میں اپنے آپ کو دوسرے بنی اسرائیل سے قطعاً الگ نہ سمجھتے تھے، اور یہودیوں سے ان کا اختلاف صرف اس امر میں تھا کہ یہ حضرت عیسیٰؑ کو مسیح تسلیم کر کے ان پر ایمان لاتے تھے اور وہ اُن کو مسیح ماننے سے انکار کرتے تھے۔ بعد میں جب سینٹ پال اس جماعت میں داخل ہوا تو اُس نے رومیوں

یونانیوں اور دوسرے غیر یہودی اور غیر اسرائیلی لوگوں میں بھی اس دین کی تبلیغ و اشاعت شروع کر دی، اور اس غرض کے لیے ایک نیا دین بنا ڈالا جس کے عقائد اور اصول اور احکام اُس دین سے بالکل مختلف تھے جسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پیش کیا تھا۔ اس شخص نے حضرت عیسیٰؑ کی کوئی صحبت نہیں پائی تھی، بلکہ اُن کے زمانے میں وہ اُن کا سخت مخالف تھا اور ان کے بعد بھی کئی سال تک اُن کے پیروؤں کا دشمن بنا رہا۔ پھر جب اس جماعت میں داخل ہو کر اُس نے ایک نیا دین بنانا شروع کیا اُس وقت بھی اُس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کسی قول کی سند پیش نہیں کی بلکہ اپنے کشف و الہام کو بنیاد بنایا۔

اس نئے دین کی تشکیل میں اس کے پیشِ نظر بس یہ مقصد تھا کہ دین ایسا ہو جسے عام غیر یہودی (GENTILE) قبول کر لے۔ اُس نے اعلان کر دیا کہ ایک عیسائی، شریعت یہود کی تمام پابندیوں سے آزاد ہے۔ اس نے کھانے پینے میں حرام و حلال کی ساری قیود ختم کر دیں، اس نے ختنہ کے حکم کو بھی منسوخ کر دیا، جو غیر یہودی دنیا کو خاص طور پر ناگوار تھا حتّٰی کہ اس نے مسیح کی اُلوہیت اور ان کے ابنِ خدا ہونے اور صلیب پر جان دے کر اولادِ آدم کے پیدائشی گناہ کا کفارہ بن جانے کا عقیدہ بھی تصنیف کر ڈالا کیونکہ عام مشرکین کے مزاج سے بہت مناسبت رکھتا تھا۔

مسیح کے ابتدائی پیروؤں نے ان بدعات کی مزاحمت کی، مگر سینٹ پال نے جو دروازہ کھولا تھا، اس سے غیر یہودی عیسائیوں کا ایک ایسا زبردست سیلاب اس مذہب میں داخل ہو گیا جس کے مقابلے میں وہ مُٹھی بھر لوگ کسی طرح نہ ٹھہر سکے۔ تاہم تیسری صدی عیسوی کے اختتام تک بکثرت لوگ ایسے موجود تھے جو مسیحیت کی اُلوہیت کے عقیدے سے انکار کرتے تھے۔ مگر چوتھی صدی کے آغاز ۳۲۵ء میں نیقیہ (NICAEA) کی کونسل نے پولوسی عقائد کو قطعی طور پر مسیحیت کا مسلّم مذہب قرار دے دیا۔ پھر رومی سلطنت خود عیسائی ہو گئی اور قیصر تھیوڈوسیس کے زمانے میں یہی مذہب سلطنت کا سرکاری مذہب بن گیا۔ اس کے بعد قدرتی بات تھی کہ وہ تمام کتابیں جو اس عقیدے کے خلاف ہوں مردود

قرار دے دی جائیں اور صرف وہی کتابیں معتبر ٹھہرائی جائیں جو اس عقیدے سے مطابقت رکھتی ہوں۔ ۳۶۷ء میں پہلی مرتبہ اتھاناسیوس (ATHANASIUS) کے ایک خط کے ذریعے معتبر و مسلّم کتابوں کے ایک مجموعہ کا اعلان کیا گیا، پھر اس کی توثیق ۳۸۲ء میں پوپ ڈمیسیس (DAMASIUS) کے زیر صدارت ایک مجلس نے کی، اور پانچویں صدی کے آخر میں پوپ گلاسیس (GELASIUS) نے اس مجموعہ کو مسلّم قرار دینے کے ساتھ ساتھ ان عقیدوں کی ایک فہرست مرتب کر دی جن کے متعلق کبھی کوئی عیسائی عالم یہ دعویٰ نہیں کر سکتا ہے کہ ان میں سے کسی عقیدے کی تعلیم خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔ بلکہ معتبر کتابوں کے مجموعہ میں جو انجیلیں شامل ہیں، خود ان میں بھی حضرت عیسیٰؑ کے اپنے کسی قول سے ان عقائد کا ثبوت نہیں ملتا۔

لیکن مسیح کے اس دنیا سے اُٹھ جانے کے چند ہی برس بعد ان تمام اصول و قواعد کو یک لخت منہدم کر دیا گیا جن پر انہوں نے اپنی دینی تجدید و اصلاح کی بنیاد رکھی تھی۔ اور مسیح کی اصل تعلیم کو ایسا بدل دیا گیا کہ دنیا میں اس کے وجود کا نام و نشان تک نہ رہا۔

قصیدہ بُردہ شریف

(حضرت کعبؓ بن زہیر و حضرت شرف الدین بوصیریؒ)

جناب شاہ بلیغ الدین صاحب

گردِ تو گردد حریمِ کائنات — از تو خواہم یک نگاہِ التفات
اے پناہِ من حریمِ کوئے تو — من بامیدے رمیدم سوئے تو
چوں بصیری از تو می خواہم کشود — تا بہ من باز آید آں روزے کہ بود

ایک شخص مسجدِ نبوی میں داخل ہوا۔ پشیماں پشیماں، ہراساں ہراساں، اُس نے کبھی حضورِ اکرمؐ کو نہ دیکھا تھا، لیکن مسجدِ نبوی کے جھرمٹ پر نظر پڑتے ہی اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی اور دل میں ستارے اُتر آئے، آگے بڑھ کر اس نے ایک گلیم پوشِ تخت نواز کو سلام کیا۔ سب کی نظریں نو وارد کی طرف اُٹھ گئیں۔ نو وارد کو پوچھنے کی ضرورت ہی نہ تھی کہ جس ذاتِ اقدس کی تلاش میں وہ نکلا تھا وہ کون سی تھی۔ دل خود گواہی دیتا تھا۔ نظریں آپ بتاتی تھیں کہ رخِ تمنّا کس کی طرف ہونا چاہیے۔ پوچھا گیا کس لیے آئے ہو؟

عرض کیا — خدا پر ایمان لانے اور آپؐ کی شہادت دینے آیا ہوں۔ میرے نصیب! اگر مجھے یہ سعادت حاصل ہو جائے۔

اسے کلمہ طیّبہ کا وِرد کرایا گیا۔ ایک ایک لفظ پر نُورِ ایمان کے سوتے اس کے دل میں پھوٹتے رہے۔ اِس منزل سے گزر کر نو وارد نے عرض کیا — یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، میں وہ گنہگارِ ازلی ہوں جس پر آپؐ سخت ناخوش ہیں۔

معلوم ہوا کہ نو وارد کوئی اور نہیں، کعب بن زہیر ہے۔ چہرہ مبارک پر نو وارد کی پچھلی خطاؤں سے ایک تکلیف دہ اثر نمایاں ہوا۔ حضورؐ اکرم نے حضرت ابوبکرؓ سے مخاطب ہو کر دریافت فرمایا ــــ وہ کیا لغو اشعار تھے۔ جو کعب نے کہے تھے؟ حضرت ابوبکرؓ نے کافر شاعر کی ہجو کا ایک شعر پڑھا۔ اُس وقت کوئی صاحبِ ایمان کعب کا عالم دیکھتا ان کا جی چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جاتی اور وہ اس میں سما جاتے۔

صدیق اکبرؓ نے شعر پڑھا ؎

سقاك ابوبكر بكاسٍ رويةً
وانهلك المامور منها وعلكا

شاعر نے عرض کیا ــــ یا رسول اللہ! وہ شعر یوں نہیں، یوں ہے۔ ذہین شاعر نے فوراً مامور کا لفظ مامون سے بدل دیا۔ اب جو شعر سنا یا گیا تو اس میں ذم کا پہلو نہیں مدح کا پہلو نکلتا تھا۔ یہ لفظی تبدیلی اظہار ندامت کی ایک صورت تھی ؎

تڑپ کے شانِ کریمی نے لے لیا بوسہ
کہا جو سر کو جھکا کر گناہ گار ہوں میں

دربارِ رحمت سے شاعر کی پچھلی گستاخیاں معاف ہوگئیں تو اب اس نے اجازت چاہی کہ ایک قصیدہ سنائے۔ یہ قصیدہ خاص اس موقع کے لیے کہا گیا تھا۔ اس کا مطلع تھا ؎

بانت سعاد فقلبي اليومَ متبولُ
مُتيّمٌ اثرها لم يُفدَ مكبولُ

زرقانی کا خیال ہے کہ سعاد کعب کی چچا زاد بہن اور محبوبہ کا نام ہے۔ عہدِ جاہلیت کا اسلوب یہ تھا کہ قصیدے کا آغاز عورتوں کے نام سے کرتے تھے۔ مطلب ہے سعاد کیا گئی غمِ عشق نے گھُلا کر رکھ دیا۔ غمِ جاناں سے رہائی کا کوئی فدیہ ہوتا ہی نہیں۔ (اس میں استعارۃً حضور کی محبت کا اظہار بھی ہے۔ لہٰ۔ ھی) اس کی تشبیب اگرچہ

اور مدح میں شاعر نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا تھا۔ جب وہ اس شعر پر آیا[۵] جس کا مطلب ہے، بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مشعلِ نور ہیں جس نے دنیا کو روشن کر دیا ہے اور اللہ کی کھنچی ہوئی تلواروں میں سے ایک تلوار ہیں جو بے دینی کی جڑیں کاٹ دیتی ہے تو شاعر پر جذب و مستی کا ایک رنگ چڑھا ہوا تھا اور محفل بھی ایک کیف و کم سے سرشار تھی۔ خوش نصیب کہ اس شاعر کی بخشش کا سامان ہو گیا۔ یہی شعر تھا کہ جس کی بدولت شاعر نے اللہ کے رسولؐ کی خوشنودی حاصل کی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شاعر کو اپنی چادر عطا کی۔ یہ ایک ایسا اعزاز و کرم تھا جس پر نسل در نسل تک شاعر اور اس کی اولاد فخر کرتی رہی اور آج بھی زبان و ادب نازاں ہیں۔ اس چادر مبارک کو حاصل کرنے کے لیے زمانۂ خلافت میں امیر معاویہؓ نے بڑی کوششیں کیں اور بالآخر حضرت کعبؓ کی اولاد سے چالیس ہزار درہم کا ہدیہ دے کر اس یادگار عطیے کو اپنے پاس لے آئے تو اُن کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ ہر عید کے موقع پر عبائے خلافت پر اُسے اوڑھ لینا باعثِ خیر و برکت سمجھتے تھے۔ ان کے بعد کے خلفاء نے بھی یہی کیا اور جب یہ چادر خلفائے بنی عباس نے حاصل کی تو ان کا بھی یہی معمول بن گیا۔

جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا اس چادر کی اہمیت اور مسلمانوں کی عقیدت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ہوتے ہوتے یہ چادر ترکانِ آلِ عثمان تک پہنچی۔ اُس وقت اِس خاندان کو عالمِ اسلام کی خلافت کا منصب حاصل تھا۔ یہ چادر قسطنطنیہ میں خاص سلطان کی نگرانی میں رہتی۔ شاہی محل میں بڑے اہتمام سے ایک حجرہ اس کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ عطریات اور خوشبویات ـــ عود و بخور کا اس جگہ خاص اہتمام رہتا۔ سوائے سلطان کے کوئی اور اُسے ہاتھ نہ لگا سکتا تھا۔ بہت خاص اور مقررہ اوقات میں زیارت کی غرض سے اس چادر کو باہر نکالا جاتا۔ اور یہ فریضہ ہمیشہ ترکی کے بادشاہ خود انجام دیا کرتے تھے۔

---

۵ ۵ إِنَّ الرَّسُولَ لَنُورٌ يُسْتَضَاءُ بِهِ
مُهَنَّدٌ مِنْ سُيُوفِ اللهِ مَسْلُولُ

خاص خاص موقعوں پر اسے بطورِ شگونِ نیک کے بھی نکالا جاتا۔ میدانِ جنگ میں بھی اسے لہرایا گیا تاکہ اس کی برکت سے مسلمانوں کو اللہ کی تائید اور نصرت حاصل ہو جائے۔

اِس قصیدے کے شاعر کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ زُہیر کے فرزند تھے۔ بعض مؤرخین نے زہیر بھی نام لکھا ہے۔ زُہیر اپنے زمانے میں عرب کے مانے ہوئے شاعروں میں ایک سمجھا جاتا تھا۔ اس کے دو بیٹے بُجیر اور کعب تھے۔ جنھیں شاعری کا ذوق ورثے میں مِلا تھا۔ انھوں نے اپنی شعلہ بیانی سے خاندان کا نام خوب روشن کیا۔

اب زمانہ تھا جب کعب بھی اور مشرکین کی طرح اسلام دشمنی میں پیش پیش تھے۔ عرب کے نہ جانے کتنے بُت پرست قبیلوں میں بُت پرست کعب نے اپنے اشعار سے مسلمانوں کے خلاف دشمنی کی آگ بھڑکائی تھی۔ اُحد اور خندق کے معرکوں سے پہلے اُنھوں نے بُت پرستوں کو خوب اُبھارا تھا۔ فتح مکہ کے موقعے پر بھی عرب کے جن چند نامور لوگوں کے دل میں دشمنی کی آگ بہت زیادہ دہک رہی تھی ان میں ایک کعب بھی تھے۔ طائف کے محاصرے کے بعد ۹ ہجری کے کچھ بہت زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ بُجیر نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ اس زمانے میں بھی کعب اسلام دشمنی پر جمے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ اپنے بھائی کے ایمان لے آنے پر اُنھوں نے سخت ہجو لکھی تھی۔ اس میں بعض اشعار بڑے گستاخانہ تھے۔ اِن اشعار میں حضور اکرمؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے خلاف یاوہ گوئی سے کام لیا گیا تھا۔ اسی ہجو کا وہ شعر تھا، جو حضرت ابوبکرؓ نے مسجد نبوی میں سُنایا تھا۔ جہاں اور بڑے بڑے سرکش، خدا کے حکم سے اس کے نبیؐ کے مطیع و فرمانبردار ہو گئے، وہاں وقت آنے پر کعب کے دل کی کدورتیں بھی ختم ہو گئیں۔ حضرت کعبؓ کی اس کے بعد کی زندگی عشقِ رسول میں ڈوبی ہوئی تھی۔

حضرت کعبؓ کا یہ قصیدہ قصیدۂ بُردہ کہلایا۔ بُردہ چادر کو کہتے ہیں۔ حضور اکرمؐ کا عطیہ اس قصیدے کو ہمیشہ کے لیے یادگار بنا گیا۔ آج بھی دُنیا بڑے ذوق اور عقیدت سے اس قصیدے کو پڑھتی ہے۔

اِس قصیدے کے علاوہ کچھ اور قصیدے بھی ہیں جو قصائد بُردہ کہلاتے ہیں ۔ ان میں ابوعبداللہ محمد بن سعد اور شرف الدین بوصیری کے قصیدے زیادہ مشہور ہیں ۔ روایت ہے کہ شرف الدین نے جب اپنا قصیدہ لکھا تو وہ برص کے مرض میں مبتلا تھے اور ان کے سارے جسم پر دھبّے پڑ گئے تھے ۔ جس رات کمالِ عقیدت اور گدازِ دل سے آپ نے اپنے قصیدے کی تکمیل کی تو خواب میں زیارتِ حضورؐ اکرم سے مشرف ہوتے ۔ دیکھا دربارِ نبویؐ میں خود کو قصیدہ سُنانے کی عزت حاصل ہو رہی ہے اور پھر سرفرازی اس انتہا کو پہنچی کہ حضرت کعبؓ کی طرح جسمِ اطہر پر سے چادرِ مبارک اُتار کر شرف الدین کو بھی عطا فرمائی گئی ۔ شرف الدین اُٹھے تو کچھ نہ پوچھیے کہ جذب و مستی کا کیا رنگ تھا ۔ کہتے ہیں قدرت نے اُنھیں اِس خواب کے طفیل برص کے مرض سے شفا دی ۔ علامہ بوصیری کے قصیدے کے دس حصے ہیں ۔ پہلا حصہ سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کی محبّت کے تذکرے پر مشتمل ہے اور یوں شروع ہوتا ہے ؎

أَمِنْ تَذَكُّرِ جِيرَانٍ بِذِي سَلَمِ
مَزَجْتَ دَمْعًا جَرَىٰ مِنْ مُقْلَةٍ بِدَمِ

کیا ذی سلم کے ہمسایے یاد آ رہے ہیں جو آنکھیں خون کے آنسو رو رہی ہیں ۔
آخری حصہ مناجات پر مشتمل ہے ۔

جانے کس گدازِ قلب کی یہ آوازیں تھیں کہ صبح و شام نے ہزاروں کروٹیں بدلیں ، لیکن یہ آوازیں آج بھی باقی ہیں اور ہمیشہ زندہ و پائندہ رہیں گی ۔

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں ۔ قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں ۔ اُن کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے ۔

(ادارہ)

کتاب سازی و کُتُب خانہ سازی

(اسلام کا ایک ثقافتی ورثہ)

جناب محمد حلیم چشتی صاحب

اِس مضمون میں اسلام کے ابتدائی دور میں اسلامی ثقافتی ورثہ کتاب سازی کی شرعی حیثیت و تحریک کتب سازی کے ابتدائی نقوش و اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے تاکہ تاریخی حقائق کی روشنی میں اسلامی کتب خانوں کی تاریخ کے سلسلہ کی ابتدائی کڑیوں کا دوسری کڑیوں سے باہمی ربط نمایاں ہوسکے۔ اور عہدِ عباسی میں کتب خانوں کی تاریخ کے رہنما خطوط واضح ہوسکیں۔ نیز ان امور کو واضح کیا گیا ہے کہ کتب خانہ کیوں کر عہد تمدن کی یادگار بنا، کن بنیادوں پر اسے ذہنی طاقت کا سرچشمہ تسلیم کیا گیا۔ اور وہ ایک تہذیبی و ثقافتی ورثہ کی اساس بن سکا جو قوم کو اپنے قومی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے سب سے زیادہ عزیز ہوتا ہے۔

مسلمانوں میں تصنیف و تالیف اور صنف وار تبویب و ترتیب

مسلمانوں میں تصنیف و تالیف، کتابوں کی ہمنسقی و صنف وار تبویب و ترتیب اور کتب خانہ سازی حالات کے پیشِ نظر کبھی واجب، کبھی مستحب اور کبھی مباح رہی ہے اس لیے کہ جب وحی آئی تو نور رسالتِ مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قلم بند کرایا۔ یہ امر واجب تھا۔ اسی

حکم میں ضمناً دینی کتب داخل ہوئیں [1] حالات کے پیشِ نظر ان کا ذخیرہ کرنا، ان کی تبویب و ترتیب کرنا بھی واجب، مستحب و مباح ہے [2] انہی وجوہ سے اقوامِ عالم کا علمی ورثہ بھی ائمہ مجتہدین کی دُور رس نگاہوں سے اوجھل نہیں رہا۔ انہوں نے اس کا بھی شرعی نقطہ نگاہ سے جائزہ لیا اسے عربی میں ترجمہ کرانے کا حکم دیا۔ چنانچہ امام شافعیؒ کتاب الام میں رقمطراز ہیں:

"عجمیوں کی جو کتابیں ملیں وہ سب مالِ غنیمت ہیں۔ خلیفۂ وقت کو چاہیے کہ ترجمہ کرنے والوں کو بلائیں۔ ان کا ترجمہ کرائیں اس لیے کہ طب وغیرہ علوم میں کوئی کراہت نہیں ہے، انہیں فروخت کریں جس طرح دوسری غنیمت کی اشیاء فروخت کی جاتی ہیں (مشرکانہ ادب پر قدغن لگائی جاسکتی ہے اسے ضائع بھی کیا جاسکتا ہے) ان کے ظروف و آلات سے فائدہ اٹھائیں، انہیں فروخت کریں۔ کتابوں کو جلانے بغیر جلانے اور دفن کرنے کی کوئی معقول دلیل نہیں ہے" [3]

---

[1] دینی کتابیں جن کا دائرہ نہایت وسیع ہے اور کہنا چاہیے کہ دین و دنیا کے جملہ علوم و فنون جن کا ایک مسلمان کی فلاح و بہبود سے کسی نوع کا بھی کوئی رشتہ ہوسکتا ہے وہ تمام علوم و کتب اس کے وسیع مفہوم میں داخل ہیں۔

[2] ابن القیم الجوزیہ، الطرق الحکمیۃ والسیاسۃ الشرعیہ تحقیق محمد جمیل غازی، القاہرہ المطبعۃ المدنی، ۱۳۸۱ھ، ص ۴۰۳۔

[3] محمد بن ادریس الشافعی، کتاب الام، القاہرہ: مکتبہ الکلیات الازہریہ، ۱۳۸۱ھ جلد ۴ ص ۲۶۳۔

امام شافعیؒ کی مذکورہ بالا تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ کتب خانہ اسکندریہ کے جلانے کا الزام مسلمانوں کے سر رکھنا قطعی بے بنیاد ہے۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو صحابہؓ کا یہ طرزِ عمل امام شافعیؒ کے لیے دلیل بنتا اور وہ مذکورۂ بالا فقہی حکم کیونکر لگاتے۔ پھر حضرت عمروؓ بن العاص جن کے سر یہ الزام تھوپا جاتا ہے ان کے فرزند ارجمند عبداللہ کے پاس مصر میں عربی کے علاوہ دوسری زبانوں کی کتابوں کا سب سے زیادہ ذخیرہ (باقی بر صفحہ آئندہ)

کتابوں کی ذخیرہ سازی

یہاں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اسلام میں کتابوں کی ذخیرہ سازی کی اصل غایت: ا۔ استفادہ و استعمال (USE & UTILIZATION) اور ب۔ افادہ و ابلاغ (INFORMATION & COMMUNICATION) ہے اہلِ علم ان کا مطالعہ کرتے، یاد کرتے، پڑھتے پڑھاتے اور ان سے تصحیح و نقل کا کام کرتے ہیں۔ کتابوں کے بغیر ان کا علم زندہ نہیں رہ سکتا اور ان کی علمی زندگی برباد ہو جاتی ہے اس لیے ان کے علمی ذخائر کو حوائج اصلیہ (BASIC NECESSITIES) میں شمار کر کے زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا[1،2] اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام میں تحصیلِ علم ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔

انسانی معاشرے کی انفرادی و اجتماعی علمی ترقی میں مذکورہ بالا مقاصد کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اسلام نے ان عظیم مقاصد کے پیشِ نظر اس قسم کے ذخائر کو پڑھے لکھوں کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) موجود تھا اور وہ ان کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ حضرت عمرو بن العاص کے ہاتھوں اگر اسکندریہ کا کتب خانہ جلایا گیا ہوتا تو وہ عجمی کتب کا ذخیرہ گھر میں کیونکر برداشت کر سکتے تھے۔ (الذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ط: ۳، حیدرآباد الدکن، مطبعۃ مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ، ۱۳۷۶ھ، جلد ۱ ص ۴۲۔

(حاشیہ صفحہ ہذا)

[1] السیوطی، کتاب الاشباہ والنظائر فی قواعد و فروع فقہ الشافعیۃ، القاہرہ، مطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی، ۱۳۷۸ھ، ص ۳۷۴

[2] ابن الہمام، شرح فتح القدیر، القاہرہ، مطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی، ۱۳۵۶ھ، جلد ۱ ص ۴۸۸۔ ابن عابدین، حاشیہ ردالمحتار شرح تنویر الابصار، ط: ۲، مصر، مصطفیٰ البابی الحلبی، ۱۳۸۶ھ، جلد ۲ ص ۲۶۲۔

کے لیے نہیں، بے پڑھے لکھوں کے لیے بھی، بشرطیکہ تجارت کی نیت سے ذخیرہ سازی نہ کی گئی ہو، ٹیکس سے آزاد رکھا ہے[1]۔ اور علمی ذخیروں کے ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقلی پر کبھی کوئی پابندی عاید نہیں کی۔ کاغذ اور کتابوں کی درآمد برآمد کی ہمت افزائی کی، ان پر بھی ٹیکس نہیں لگایا۔ چنانچہ اسلامی قلمرو میں ایشیا سے افریقہ اور یورپ (ہسپانیہ) تک کتب خانوں کی روز افزوں ترقی میں یہ عوامل مددگار و معاون رہے ہیں۔

وسائل و مظاہرِ تہذیب و ثقافت کی ہمت افزائی

اسلام بنی نوع انسان کی مادی ضروریات کے فراہم کرنے پہ اکتفا نہیں کرتا، بلکہ تہذیب و ثقافت کے وسائل و مظاہر کو مہیا کرنے اور انہیں پروان چڑھانے کا بھی ضامن ہے وہ اس امر کی ترغیب ہی نہیں دیتا، اسے اہم اور ضروری قرار دیتا ہے۔ چنانچہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے عوام کی تعلیم و تربیت کے لیے مختلف اطراف میں علما بھیجے، خلفائے راشدین کا بھی یہی معمول رہا۔ عہدِ عثمانی میں مصحف کے ساتھ مقرّی (جو قراءت و معانی کی طرف رہنمائی کرتے تھے) اسلامی قلمرو کے مرکزوں میں بھیجے گئے تھے[2]۔

اسلام ہی دار المصاحف و بیت المصاحف سے دار الکتب کا آغاز ہوا اور کتب خانہ تہذیب و ثقافت کا مظہر و عہد تمدن کی یادگار قرار پایا۔ ابن خلدون کہتا ہے:

> تعلیم و کتب خانے دَورِ تمدن کی یادگار ہوتے ہیں، جو قوم جتنی متمدن ہوتی ہے اسی نسبت سے اس کے علوم و فنون کو ترقی ہوتی ہے۔ صنعتوں اور

---

[1] حاشیۃ الشیخ الشلبی علی تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق للزیلعی۔ مصر: المطبعۃ الامیریہ ۱۳۱۳ھ جلد ۱ ص ۲۷۳

[2] محمد عبد العظیم الزرقانی، مناہل العرفان، ط: ۲، القاہرہ: عیسی البابی الحلبی ۱۳۷۱ھ جلد ۱ ص ۳۹۶ - ۳۹۷۔

حرفتوں کو فروغ حاصل ہوتا ہے[1]

اسلام کے تمدن کی پہلی اینٹ مکہ میں رکھی گئی۔ سب سے پہلا مدرسہ مکہ میں کوہِ صفا پر دارِ ارقم میں قائم کیا گیا جو اب مسجد الحرام کی توسیع میں حرم کے اندر آ گیا ہے: اس میں قرآن کی آیتوں اور سورتوں کا نزول ہوا۔ اِسی درس گاہ میں بیٹھ کر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو اسلام و قرآن کی تعلیم و دعوت دی[2]۔ افراد کی سیرت و کردار کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے قرآن کی تفہیم و تشریح کو ذہنوں میں نقش کیا[3]، جس سے صحابہ کرامؓ کا شعور بیدار ہوا۔

ابلاغِ علم اور قرآنِ مجید کی آیات و سور کی جمع و تدوین سے صحابہ کرامؓ کے گھروں میں انفرادی ذخیروں سے کتب خانوں کی داغ بیل پڑی۔ اور علم و کتاب کا چرچا ہونے لگا۔ چنانچہ عمر فاروقؓ سورہ طٰہٰ کو پڑھ کر ہی مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ جو ان کی ہمشیرہ حضرت فاطمہؓ کے گھر میں پڑھی جاتی اور محفوظ تھی[4]۔ تا آنکہ عہدِ عباسی میں کتب خانوں کی تحریک اتنی عام ہوئی کہ کتب و کتب خانے مسلم معاشرے کے لوازمِ حیات بن گئے۔

مکہ کے بعد اسلام کے تمدن کا آغاز ہجرت کے بعد مدینہ منورہ سے ہوا۔ یہ شہر سب سے پہلے اسلام کی تحریکِ ابلاغ و تحریکِ تعلیمِ عامہ کا مرکز بنا۔ مسجدِ نبوی کو اسلام کی پہلی درس گاہ بننے کا شرف حاصل ہوا۔ ابلاغِ عامہ کے لیے مدینہ کی ۹ مسجدوں میں

---

[1] ابن خلدون، المقدمہ، بیروت: دار الکتاب اللبنانی، ب۔ت، جلد ۱ ص ۳۵۴۔

[2] علی عبدالرحمٰن۔ کنوز العلم فی ام القریٰ، الکتاب، شمارہ ۲ (۱۹۶۸ء)، ص ۲۲

[3] السیوطی، الاتقان، جلد ۲ ص ۲۰۸۔

[4] ابن سعد، کتاب الطبقات الکبیر، لیڈن، مطبعۃ بریل ۱۳۲۲ھ جلد ۳ ص ۱۹۲
السہیلی، الروض الانف تحقیق طٰہٰ عبدالرحمٰن سعد، القاہرہ: مکتبۃ الکلیات الازہریہ ۱۳۹۱ھ جلد ۲ ص ۹۶۔

تعلیم کا سلسلہ جاری ہوا[1] مدینہ سے علوم کی کرنیں پھوٹیں۔ یہی شہر مرکز علم بنا اور دار السنہ، دار الہجرہ اور دار النصرہ کے لقب سے ممتاز ہوا[2]۔

مذکورہ بالا رہنما خطوط کے مطابق اسلامی عہد میں جو شہر تمدنی حیثیت سے ممتاز رہے وہ تعلیم عامہ کے مراکز بھی رہے۔

مدینہ منورہ کی علمی اہمیت وحیثیت کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ امام مالکؒ کے یہاں تعاملِ اہلِ مدینہ ایک شرعی حجت ہے[3]۔

۱۔ حمید اللہ، صحیفہ ہمام بن منبہ، ط: ۴، حیدر آباد دکن، مکتبہ نشاۃ ثانیہ، ۱۳۷۸ھ ص ۱۹۔

۲۔ علی بن احمد السمہودی، وفا الوفا باخبار دار المصطفیٰ تحقیق محمد محی الدین عبد الحمید، مصر، مطبعۃ السعادہ ۱۳۷۴ھ جلد ۱ ص: ۱۵۔ (ل) خلاصۃ الوفا باخبار دار المصطفیٰ، مکہ، المطبعۃ المنیریہ، ۱۳۱۶ھ، ص: ۵۔ ابن تیمیہ، صحۃ اصول مذہب اہل المدینہ تحقیق زکریا علی یوسف۔ ط: ۲۔ القاہرہ، مطبعۃ الایام، ب ت، ص: ۱۷۔

۳۔ محمد بن ادریس الشافعی، الرسالہ تحقیق احمد محمد شاکر، مطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی، ۱۳۵۸ھ، ص ۵۳۳۔

عبد العزیز البخاری، کشف الاسرار علی اصول فخر الاسلام علی بن محمد البزدوی، آستانہ حسن حلمی، ۱۳۰۷ھ جلد ۳، ص: ۹۶۱۔

ابن حزم، احکام فی اصول الاحکام، القاہرہ، مکتبہ عاطف، ۱۳۹۶ھ، جلد ۱ ص: ۲۰۲، ۱۷۔

محمد الغزالی، کتاب المستصفیٰ، مصر، مطبعۃ بولاق، ۱۳۲۲ھ جلد ۱ ص ۱۸۶۔

عبد العلی، فواتح الرحموت بشرح مسلم الثبوت جلد ۲ ص ۲۳۲۔ (یہ کتاب المستصفیٰ کے ساتھ طبع ہوئی ہے۔)

محمد الخضری بک، اصول الفقہ، ط: ۶، القاہرہ: المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ ۱۳۸۹ھ ص ۲۷۷۔

الخضری، تاریخ التشریع الاسلامی ط: ۹، القاہرہ: المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ، ۱۳۸۵ھ ص: ۲۲۲۔

اَدوارِ مابعد

دَورِ مرتضوی میں مرکزِ خلافت جب عراق منتقل ہوا تو علمی و کتابی ترقی کا شرف کوفہ و بصرہ کو حاصل ہوا۔ کوفہ کو قبۃ الاسلام اور اہل الاسلام[1] اور بصرہ کو چشمِ عراق کہا جانے لگا۔[2] کوفہ میں فقہ حنفی کی تدوین ہوئی، کوفہ و بصرہ ہی میں نحو و لغت کی آبیاری ہوئی، دو مکاتبِ فکر یا دبستانِ بصرہ و کوفہ کے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے، علوم نحو و لغت پروان چڑھے، دبستانِ فکر و نظر یعنی عقائد و کلام یہیں پیدا ہوئے۔ قراءات و روایات کا یہاں زیادہ چرچا رہا۔[3]

دَورِ اموی میں دار الخلافہ جب سرزمینِ شام میں منتقل ہوا تو مرکزِ علم دمشق بن گیا۔ خلیفۂ راشد عمر بن عبد العزیز کے دَورِ خلافت میں حکومت کی طرف سے تدوینِ سنت (احادیث و آثار) کے احکام جاری کیے گئے۔[4] بنی امیہ نے اطرافِ بلاد میں ابو عمرو عبد الرحمن بن عمرو اوزاعی (۸۸ — ۱۵۷ھ - ۷۰۷ تا ۷۷۴ء) کے فقہی مسلک کی نشر و اشاعت میں مدد کی اور انہیں جامعِ دمشق و محلاتِ شاہی میں درس کے حلقے قائم کرنے پر مامور کیا۔[5] ابن قتیبہ المتوفی ۲۷۶ھ نے انہیں

---

[1] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، بیروت: دار صادر للطباعۃ والنشر، جلد ۲، ص: ۶
عبد الکریم السمعانی، الانساب، لیدن: مطبوعۃ بریل، ۱۹۱۲ء، ورق ۴۰۔

[2] ابن قتیبہ، عیون الاخبار، القاہرہ: مطبعۃ دار الکتب المصریۃ، ۱۳۴۳ھ، جلد ۲ ص: ۲۲۲
الثعالبی، لطائف المعارف، تحقیق ابراہیم الابیاری حسن کامل الصیرفی مصر، عیسی البابی الحلبی ۱۳۷۹ھ، ص: ۱۶۷۔

[3] ابو عبد اللہ الحاکم نیشاپوری، معرفۃ علوم الحدیث، تحقیق معظم حسین، القاہرۃ: مطبعۃ دار الکتب المصریۃ، ۱۹۳۷ء، ص: ۲۴۴ - ۲۴۹۔

[4] ابن عبد البر، جامع بیان العلم و فضلہ مصر، ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ، ۱۳۲۹ھ جلد ۱ ص: ۷۰۔ ابن حجر، فتح الباری جلد ۱ ص: ۲۰۴۔

[5] امیر شکیب ارسلان، محاسن المساعی فی مناقب الاوزاعی ص ۱۰۲ - ۱۰۶۔

اصحاب الرائے میں شمار کیا ہے[1] اور عبدالرحمٰن بن مہدی المتوفی ۱۹۷ھ کا قول ہے کہ فنِ حدیث میں چار امام ہیں :-

۱- اوزاعی ۲- مالک ۳- سفیان ثوری ۴- حماد بن زید[2]

عہدِ عباسی میں بغداد کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی تو بغداد معدنِ علم و فن بنا۔ یہ مدینۃ الاسلام دقبۃ الاسلام کے لقب سے ممتاز ہوا[3]۔ یہاں امام ابو یوسفؒ نے مالیات کے موضوع پر کتاب الخراج لکھی۔ امام محمدؒ نے جنگی احکام پر کتاب السیر الصغیر و کتاب السیر الکبیر مرتب کیں جنہیں خلیفہ ہارون الرشید نے اپنے عہد کے مفاخر میں شمار کیا ہے[4]۔ اسی سرزمین پر فقہ کے مشہور مذاہب اربعہ میں حنبلی مذہب کی نشوونما ہوئی۔ بغداد میں جو اصحاب الرائے کا مرکز تھا، اسی سرزمین پر فقہ ظاہریہ کی تدوین عمل میں آئی۔ یہیں فنِ جرح و تعدیل کی تدوین ہوئی۔

تاریخِ اسلام میں سرزمین عراق کو ہی یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں اہل السنۃ والجماعۃ کے شہرۂ آفاق چار دبستان فقہ سے تین حنفی، شافعی و حنبلی کو نشوونما نصیب ہوا۔ یہ فضیلت و امتیاز جب مصر کو نصیب ہوا تو یہاں امام لیث بن سعد (۹۴ — ۱۷۵ھ / ۷۱۳ تا ۷۹۱ء) کے فقہی مسلک کا آغاز ہوا۔ جن کے متعلق امام شافعی کا قول ہے کہ لیث امام مالکؒ سے زیادہ فقیہہ تھے۔ لیکن ان کے تلامذہ نے ان کو ضائع کر دیا، اس لیے کہ

---

[1] ابن قتیبہ۔ المعارف، تحقیق ثروت عکاشہ، القاہرہ، مطبعۃ دار الکتب، ۱۹۱۰ء ص ۴۹۶-۴۹۷۔

[2] ابن ابی حاتم الرازی، تقدمۃ الجرح والتعدیل، حیدرآباد الدکن، مطبعۃ مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ ۱۳۷۱ھ ص ۲۰۳ (ملۃ)، کتاب الجرح والتعدیل، جلد ۲ ق ۲، ص ۷ - ۲۶۶۔

[3] یاقوت، معجم البلدان، بیروت : دار صادر للطباعۃ والنشر ۱۳۷۴ھ جلد ۱ ص ۴۶۱

[4] محمد بن محمد السرخسی، شرح کتاب السیر الکبیر للامام محمد، تحقیق صلاح الدین المنجد، القاہرہ، شرکۃ الاعلانات الشرقیۃ، ۱۹۷۱ء جلد ۱ ص ۴۔

انہوں نے اُن کی فقہی آرا اور علوم کو مدوّن نہیں کیا۔[۱] یہاں از سرِ نو فقہ شافعی کو ترتیب دیا گیا۔ جیسا کہ امام شافعیؒ کے قولِ قدیم جس کا تعلق بغداد اور قولِ جدید (کتاب الام) جس کا تعلق مصر سے ہے، عیاں ہے۔

پھر خراسان میں نیشاپور کو اور مغرب میں قیروان و قرطبہ کو علمی تفوق حاصل ہوا۔ یہاں علمی ترقی کا دور دورہ ہوا تو کوفہ و بصرہ کے ائمہ نحو و لغت کے طبقات کے ساتھ اہل قیروان و قرطبہ کے ائمہ نحو و لغت کے طبقات کو بھی بیان کیا جانے لگا۔[۲] ابن خلدون کہتا ہے:

"بغداد، قرطبہ، قیروان، بصرہ اور کوفہ کو دیکھو جب یہاں اسلام کے ابتدائی زمانہ میں تمدن پھیلا اور عمرانی ترقی درجہ کمال کو پہنچی تو ان شہروں میں علم کے سمندر جوش مارنے لگے، یہاں کے باشندے تعلیمی اصطلاحات و مسائل کے استنباط میں تفننِ طبع دکھانے لگے اور متقدمین سے بھی گوئے سبقت لے گئے جب یہاں تمدن کو زوال آیا اور حالت ابتر ہوگئی تو بساطِ علم اُلٹ گئی اور علم و تعلیم یہاں سے مفقود ہو کر دوسرے شہروں میں منتقل ہو گئے"۔

جب بغداد، بصرہ اور کوفہ جیسی علم کی کانیں مٹ گئیں تو ان سے بڑے بڑے شہر آباد ہوئے اور علم کا مرکز عراق عجم میں منتقل ہو کر خراسان و ماوراء النہر میں قائم ہوا۔ پھر قاہرہ میں منتقل ہوا، قاہرہ کی تمدنی حیثیت چونکہ مسلسل قائم رہی اس بنا پر یہ ہر زمانے میں علم کا مرکز رہا، اس لیے جو لوگ دیارِ مغرب سے علم حاصل کرنے کے بعد دیارِ مشرق میں آتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ اہل مشرق کی عقل و ذہانت اہلِ مغرب سے زیادہ ہوتی ہے اور وہ فطرتاً طور پر ان سے زیادہ عقل مند اور تیز ہوتے ہیں۔ اس طریقے سے وہ مغرب (یورپ ہسپانیہ) اور مشرق (ایشیا و افریقہ) کے باشندوں کی انسانی خصوصیتوں میں فرق سمجھنے لگے ہیں۔ حالانکہ یہ بات درست نہیں ہے......

---

[۱] ابن حجر، الرحمۃ الغیثیہ بالرحمۃ اللیثیہ، مصر، المطبعۃ امیریہ، ۱۳۰۱ھ، ص: ۶

[۲] ابوبکر محمد الزبیدی، طبقات النحویین واللغویین، تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم، مصر، محمد سامی امین الخانجی، ۱۹۵۴ء، ص: ۲۴۰-۲۴۵۔

اہلِ مشرق تمدنی ترقیوں کی مسلسل مشق جاری رکھنے کے باعث اہل مغرب سے بڑھ گئے ہیں، ان کی تمام عقلی ترقیوں کا حقیقی سبب یہی ممارست وانہماک علمی درتدریسِ کتب وکتب خانے ہیں[1]۔

فتوحاتِ اسلامی کی وسعت وتعلیم عامہ کے مراکز

عہدِ رسالتؐ سے تعلیم کا آغاز ہوا لیکن سو سال کی مختصر سی مدت میں تعلیم کو ایسی ترقی ہوئی کہ فتوحاتِ اسلامی کا دائرہ جتنا وسیع ہوتا گیا تعلیم کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہوا۔ چنانچہ علامہ ابن حزم فرماتے ہیں:-

جسے تاریخ کا تھوڑا سا بھی علم ہے وہ یقیناً یہ بات جانتا ہے کہ تابعین نے سندھ، خراسان، آرمینیہ، آذربائیجان، موصل، دیارِ ربیعہ، دیارِ مصر، شام، افریقہ، اندلس، حجاز، یمن، پورا جزیرہ عرب، عراق، فارس، کرمان، سجستان، کابل، طبرستان، جرجان اور جبال میں اسلام پھیلایا اور نورِ علم سے گوشہ گوشہ منور کر دیا تھا۔ الحمدللہ ان مذکورہ شہروں میں کوئی بستی ایسی نہ تھی جس میں "مفتی" اور "مقری" نہ ہو، اکثر شہروں میں تو ایک سے زیادہ "مفتی" و "مقری" موجود تھے[2]۔

اس سے معلوم ہوا کہ چھوٹی چھوٹی بستیوں میں بھی کئی کئی مقری ومفتی (معلم اور لائبریرین) (ریفرنس اسسٹنٹ) موجود تھے۔ مؤرخ شمس الدین ذہبی "تذکرۃ الحفاظ" میں طبقہ ثانیہ کے اختتام پر ۱۰۰ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں کہ "پہلی صدی ہجری میں اہلِ علم وائمہ اجتہاد، زہاد، عباد، اقطاب، اغواث اور ابدالوں کی ایک بہت بڑی خلقت

---

[1] ابن خلدون ص ۸۴ - ۸۵۔

[2] ابن حزم، الاحکام فی اصول الاحکام، تحقیق احمد محمد شاکر، مصر، مطبعۃ السعادۃ، ۱۳۴۷ھ، جلد ۵، ص: ۱۰۴۔

بلادِ اسلامی میں آباد تھی۔ ممکن ہے ہم نے ان میں سے جن کا تذکرہ چھوڑ دیا ہے وہ ان سے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے، علم و فضل، عبادت و ریاضت اور کارناموں میں زیادہ بڑھ چڑھ کر ہوں۔ پہلی صدی ہجری میں اسلام کا خوب بول بالا ہوا اور گوشہ گوشہ میں اسلام پھیل گیا تھا۔[1]

مورخ موصوف نے تیسرے طبقے کے خاتمہ پر مختلف بلاد کے فقہا، محدثین و حفاظ کے نام پانچ صفحوں میں گنائے ہیں جن کی مساعی جمیلہ سے علوم و فنون کو فروغ حاصل ہوا تھا۔[2] تعلیم کا جہاں اتنا رواج اور چرچا ہو وہاں ممکن نہ تھا کہ کتب خانے نہ ہوں، انہی وجوہ سے ہم نے عہدِ رسالت، خلافتِ راشدہ و دَورِ اموی میں کتب خانوں کا سراغ لگایا اور اس دَور کے کتب خانوں کا تذکرہ " عہدِ رسالت سے دَورِ اموی تک کتب خانوں کا ارتقاء" میں پیش کیا ہے۔[3]

بلاشبہ عہدِ رسالت، خلافتِ راشدہ اور دَورِ اموی میں بعض علوم کی تدوین کا آغاز ہوا، انفرادی، عوامی اور شاہی کتب خانوں کی داغ بیل پڑی، لیکن عہدِ رسالت سے دَورِ اموی تک خالص عربی تمدن جلوہ فگن رہا۔ عربوں کا ہی قوتِ حافظہ پر جیسا کچھ اعتبار و اعتماد اور فخر و ناز تھا وہ آفتاب سے زیادہ روشن ہے، چنانچہ یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ وہ اپنا پورا علمی و ثقافتی ورثہ، نسب نامے، جنگی کارنامے بڑے بڑے خطبے، لمبے لمبے قصیدے سب حافظہ میں محفوظ رکھتے تھے اور انہیں قیدِ تحریر

---

[1] شمس الدین محمد بن احمد الذہبی، تذکرۃ الحفاظ ط: ۳ حیدر آباد الدکن، مطبعۃ مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ - ۱۹۵۶ء، جلد ا ص: ۷ حیثی، ص ۳ - ۴

[2] الذہبی: تذکرۃ الحفاظ، جلد ا ص: ۱۰۲ - ۱۰۷

[3] یہ وہ مقالہ ہے جو راقم السطور نے علم کتب خانہ کے موضوع پر ایم - اے کی ڈگری کے لیے لکھا تھا۔

یں لانا عار سمجھتے تھے[۱]۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان کے یہاں کوئی کتابی مواد ہی نہ تھا، رسالت مآب کے معاہدات، فرامینِ ذاتی و سرکاری خطوط اور قرآن و سنّت کا تحریری سرمایہ موجود تھا، جس کا تذکرہ مذکورہ بالا مقالہ میں کیا گیا ہے۔

عربوں کو اپنی قوت حافظہ پر غیر معمولی اعتماد اور تحریری مواد کی قلت کی وجہ سے ان کے تحریری سرمایہ میں نوع و کثرت نہیں آسکی تھی اور نہ بہت اعلیٰ پیمانے پر ان کے علوم و فنون کی تدوین ہی کی جا سکی تھی۔ اس لیے اس دور کے کتب خانوں کے ذخیرہ میں ایسی جامعیت، تنوع و کثرت پیدا نہ ہوئی جو بعد کے ادوار میں ہوئی۔ اس دور کا سب سے بڑا کارنامہ صرف ابلاغ اور کتب خانوں کی تحریک کا وہ آغاز ہے جس سے علم و کتاب کے سلسلے کا احیاء ہوا تھا۔ اس کو ترقی دینا کتب اور کتب خانوں کے متنوع اقسام کے ترقی پذیر سلسلہ کو نئی اور مضبوط بنیادوں پر فروغ دینا عباسی خلفاء کا کارنامہ ہے۔

(باقی)

---

[۱] احمد بن علی الخطیب البغدادی، تقیید العلم، تحقیق یوسف العش، دمشق، المعہد الفرنسی ۱۹۴۹ء، ص ۱۱۰۔

میرے مشاہدات و تجربات

۱۔ مشاہدات

جناب سید اسعد گیلانی صاحب

یوں تو ہر زندگی مشاہدات سے معمور اور تجربات سے بھرپور ہوتی ہے، لیکن زندگی کا بہت بڑا تجربہ یہ ہے کہ انسان ان مشاہدات و تجربات کو بہت کم یاد رکھتا ہے۔ وہ ایک ہی تجربے سے بار بار دوچار ہوتا رہتا ہے۔ ایک ہی بل سے کئی کئی بار ڈسا جاتا رہتا ہے۔ دجل و فریب اور بے وفائی و طوطا چشمی کے مناظر کا بار بار مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ لیکن پھر انہی سے دھوکا کھاتا اور انہی کے فریب میں آتا رہتا ہے۔ ایسے کم ہی انسان ہوں گے جو فریبِ اعتماد کا شکار نہ ہوئے ہوں اور دامنِ محبت میں پوشیدہ ہو لئے نفس کو پہچان کر اس سے بچ نکلتے ہوں۔ شاید مظاہر سے فریب خوردگی انسانی فطرت اور اس دنیا کی زندگی کا طبعی خاصا ہے اور جو اس سے نکلیں انہیں آخر اس دنیا کی مخلوق کیونکر کہا جاسکتا ہے۔

گم گشتہ مشاہدات و فراموش کردہ تجربات کو کھنگالا جائے تو وہ اس قوت اور معنویت کے ساتھ حافظہ کے پردے پر نمودار نہیں ہوتے جن سے واضح اسباق سامنے آسکیں بلکہ ان کا دھندلا پن محض کسی زخم کے نشان کی مانند ہوتا ہے جس میں نہ درد ہوتا ہے اور نہ ٹیس، پھر بھی مشاہدات و تجربات کا تذکرہ خود ایک دل خوش کن تجربہ ہو سکتا ہے۔

۱ ـــ زندگی کے حقائق میں ایک بہت بڑی تلخ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو ایک نامکمل دنیا میں بھیجا گیا ہے لیکن ہر انسان اسے مکمل دنیا سمجھ کر اس میں اپنی زندگی کا سفر شروع کرتا ہے۔ اس معمولی سے فرق سے زندگی کے مجموعی طرزِ عمل اور اس کے نتائج میں بہت بڑا فرق واقع ہوتا ہے۔

یہ دُنیا مشاہدات و تجربات کی دُنیا ہے۔ یہ مظاہر اور مناظر سے بھرپور دُنیا ہے۔ اس کا ہر منظر اور ہر مظہر ایک حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے لیکن وہ حقیقتِ عظمیٰ خود انسان میں پوشیدہ رکھی گئی ہے۔ اس کی ساری زندگی کی کامیابی کا مدار اس بات پر ہے کہ وہ دنیا کی یہ پہیلی بوجھ سکے کہ کیا یہ سب مظاہر اور مناظر ہی مکمل اور کامل دُنیا ہے یا اس کے پیچھے کوئی اور حقیقت بھی پوشیدہ ہے، یہ عمل، سوچ، غور و فکر، فراغت، یکسوئی، من میں ڈوب جانے اور سراغِ زندگی پانے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کے تجسسِ ابراہیمی کی ضرورت ہوتی ہے۔

ـــ گوتم نے بادشاہت کیوں چھوڑی تھی؟

ـــ حضرت ابراہیمؑ آگ میں ڈال دیئے جانے پر کیوں راضی ہو گئے؟

ـــ حضرت عیسیٰؑ نے صلیب پر لٹکائے جانے کو کیوں پسند کر لیا؟

ـــ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مکہ کی گلیوں، طائف کے بازاروں میں پتھر کھانے اور خندق کے معرکے میں پیٹ پر پتھر باندھ لینے کو کیوں گوارا کر لیا تھا؟

انہیں کیا مجبوری تھی؟ انہیں کس حقیقت کے عشق نے یہ سب کچھ سہہ جانے پر آمادہ کر لیا تھا؟ وہ لوگ تو انسانیت کا کُندن اور جوہر تھے۔ ضرور کوئی بات تھی..... پتہ چلا کہ وہ بات یہ تھی کہ حقیقتِ عظمیٰ سے ان کی براہ راست آشنائی ہوئی اور یہ سب کچھ وہ اسی حقیقتِ عظمیٰ کے اشارے پر کر گزرے۔ تو وہ حقیقتِ عظمیٰ کیا ہے جس کے لیے عظیم لوگ عظیم قربانیاں دینے پر آمادہ ہو گئے اور پھر ان قربانیوں نے انہیں اور عظیم تر بنا دیا۔ وہ حقیقت "عرفانِ الٰہی" ہے۔

ہر انسان کو اس عرفان کی ضرورت ہے لیکن انسان دنیا میں ایسی آنکھیں لے کر آتا ہے جو صرف مظاہر کا مشاہدہ کرتی ہیں - اس کے سامنے کائنات کی کتاب کھلی پڑی ہوتی ہے - لیکن وہ اس کتاب کو پڑھ نہیں سکتا - اس کی آنکھوں پر مختلف قسم کی پٹیاں بندھی ہوتی ہیں - وہ پٹیاں اُتارنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے - آبائی مذہب کی رکاوٹیں، ماحول کے بندھن، معاشرے کے تصورات و رجحانات کا بہاؤ، قیادت و حکومت کا دباؤ - بے چارہ انسان جو معاش کی لگام میں بندھا ہوا زندگی کی گاڑی میں جتا ہوا بہت کم ہی فرصت پاتا ہے کہ ایسے گھمبیر اور فکر انگیز موضوعات پر سوچ سکے - اس لیے وہ اس نامکمل دنیا کو مکمل دُنیا سمجھ لیتا ہے - مظاہر حقیقت کو وہ مناظر فطرت سمجھ کر ان سے لطف اندوز تو ہوتا ہے لیکن ان کے ذریعے کسی حقیقت تک پہنچنے کا راستہ تلاش نہیں کر پاتا اور یوں زندگی کے ایام بظاہر سورج کی روشنی میں لیکن فی الحقیقت اُلجھے ہوئے افکار کے اندھیرے میں گزار کر قبر کی تاریکی میں چلا جاتا ہے - کبھی اسے تلاشِ حقیقت کی توفیق مل جاتی ہے اور کبھی وہ اس سے بے بہرہ ہی عمر گزار دیتا ہے اور پھر قبر کی تاریکی میں پہنچ کر ہی حقیقت کی روشنی اس پر نمودار ہوتی ہے۔

میرے لیے تلاشِ حقیقت کا یہ مرحلہ بڑا سخت اور دشوار تھا - جوانی کے ابتدائی ایام میں برسوں تک صرف قلبی اضطراب میں ہی مبتلا رہا - یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ ہماری زندگی اور اس کائنات کا باہمی رشتہ کیا ہے - زندہ رہ کر کچھ کارروائیاں کر جانے میں کیا غرض پوشیدہ ہے - مر کر مٹی ہو جانے کا مفہوم کیا ہے - اگر مر کر صرف مٹی ہی ہو جانا تھا تو پھر یہ پیدائش کا سلسلہ کیا اور کیوں ہے؟ ہم مسلمان نماز روزہ کرتے ہیں - دیگر مذاہب ماننے والے انہی اغراض کے لیے دوسرے انداز میں خدا کی عبادت کرتے ہیں، تو ہمارے مسلمان پیدا ہو جانے میں ہمارا کیا کمال ہے کہ ہم خدا کی جنت کے حق دار ہیں اور دوسرے صرف حادثۂ پیدائش کے سبب دوزخ کا ایندھن کیوں بن جائیں گے۔

میں نے ۲۲ سال کی عمر میں اپنے اس اضطراب کو ایک خط کی صورت میں لکھ کر ان بزرگوں کی خدمت میں روانہ کیا جن پر اس عمر میں مجھے سب سے زیادہ اعتماد تھا۔

۱- میرے ہونے والے خسر صاحب نے لکھا، "تم خاندانِ سادات سے تعلق رکھتے ہو، تمھیں اپنی مغفرت پر مکمل یقین ہونا چاہیے۔ نسب کا رشتہ قیمتی ہے اس پر اعتماد پیدا کرو"۔ لیکن مجھے اس جواب نے مطمئن نہ کیا۔

۲- بڑے بھائی جان نے لکھا "تم دینیات کا مطالعہ کرو" چنانچہ میں نے دینیات کا گہرا مطالعہ شروع کر دیا۔

۳- والد صاحب نے لکھا، "جوانی میں مجھے بھی ایسے ہی اضطراب سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ تلاش جاری رکھو"۔ چنانچہ میں نے تلاش جاری رکھی۔

۴- مولانا اشرف علی تھانوی نے لکھا، "قرآن و سنّت میں ہدایت کا راستہ ہے وہیں تلاش کرو"۔ چنانچہ میں نے ان کا مطالعہ شروع کر دیا اور حقیقت یہ ہے کہ حقیقتِ عظمیٰ کا انکشاف مجھ پر قرآن و سنّت کے مطالعہ سے ہی ہوا۔

مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا ایک خدا ہے جو اپنی سلطنتِ کائنات میں حاکم مطلق ہے۔ انبیاءکرام اسی کا پیغام لے کر آتے رہے ہیں۔ قرآن اسی کا آخری پیغام ہے۔ ہم اسی کے بندے اور غلام ہیں، ہم اس کی پیدائشی رعایا BORN SUBJECTS ہیں۔ سلامتی کا راستہ یہ ہے کہ ہم اسی کے قانون کے تابع ہو کر رہیں۔ اگر تابع ہو کر رہیں گے تو مرنے کے بعد مالک کی خوشنودی کا مقام حاصل ہوگا جو بندگی کا مقامِ بلند ہے ورنہ اس کی ناراضگی کے مقام کی سزا ملے گی، جو بدترین جگہ ہے۔ بس اس شعور کے بعد کائنات کے ساتھ اپنے رشتے کا مفہوم میری سمجھ میں آ گیا۔ پیدائش، زندگی، اعمال، موت، فنا و بقا کے سارے مسائل خود بخود حل ہو گئے۔ جس کے نتیجے میں مجھ پر زندگی کا عقدہ کھل گیا اور اضطراب رفع ہو گیا۔

۲- مشاہدۂ حقیقت کے بعد دوسرا تجربہ مجھ پر اس انسان کے ساتھ پیش آیا جو

اس زمین پر آباد ہے اور جو ہم سے ہے اور ہم اس سے ہیں۔

یہ تجربہ انتہائی شیریں بھی ہے اور انتہائی تلخ بھی۔ بعض انسانوں کے ساتھ مل کر، ان سے معاملات کر کے، ان سے مشورے حاصل کر کے، ان کی صحبت میں بیٹھ کر اور ان کی رفاقت میں چل کر جنت کی سی خوشبو محسوس ہوئی اور یوں لگا کہ اگر یہ لوگ اس سرزمین میں نہ ہوتے تو یہ دنیا کتنی بھیانک ہوتی۔ اور بعض انسانوں کی ملاقات سے ایسی تلخ یادیں وابستہ ہو گئیں کہ دنیا کا اعتبار ہی اُٹھ گیا اور بارہا جی چاہا کہ کسی جنگل کے کھوہ یا کسی پہاڑ کی غار میں جا کر آباد ہو جانا اس سے بہتر ہے کہ انسان ایسے لوگوں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے اور ملنے جلنے پر مجبور رہو۔ انسانی تجربات میں سب سے انوکھا تجربہ خود انسان ہے۔ جس کے ہزاروں رنگ روپ اور ہزاروں مزے ہیں۔ اتنی تنوع مخلوق اور کوئی نہیں ہے۔ یہ انسان احساسِ مروّت کے تحت دوسرے انسانوں کی خاطر جان پر کھیل جاتا ہے اور یہ انسان ہوسِ اقتدار کی خاطر انسانوں کو قتل کرتا ہے۔ بھائیوں کو ہاتھیوں کے پاؤں تلے روندواتا ہے۔ اور ماؤں کی گودوں میں شیر خوار بچوں کو ذبح کرا دیتا ہے۔ یہ انسان اپنے ملک و قوم کی خاطر دشمنوں کے سامنے سینہ سپر ہوتا اور ہوائی جہازوں سے عین دشمنوں کی صفوں میں چھلانگیں لگاتا ہے اور یہی انسان اپنے اقتدار کے لیے اپنے ہی ملکوں کو توڑتا اپنی ہی قوموں سے غداری کرتا اور اپنی ہی قوم کو ذبح کرتا ہے۔ یہ انسان بڑا معمّا ہے۔ اپنے تجربے پر میں برسوں غور کرتا رہا ہوں۔ پھر مطالعہ قرآن و سنّت سے ہی یہ عقدہ کھلا کہ دراصل یہ دنیا مخلوط آبادی ہے۔ اور اس کمرۂ امتحان میں بیٹھ کر ہر انسان اپنا اپنا پرچۂ عمل حل کر رہا ہے۔ یہاں کا امیر اپنی دولت میں شرافت کا، اور یہاں کا غریب اپنی غربت میں وقارِ انسانیت کا امتحان دے رہا ہے۔ یہ شاہ و گدا، یہ حاکم و محکوم، یہ ظالم و مظلوم، درحقیقت مختلف کردار ہیں جو اپنے اپنے منصب و مقام کے پرچے حل کر رہے ہیں۔ ہر روز ہزاروں کے ہاتھ میں امتحان کے پرچے دیئے جاتے ہیں اور ہزاروں سے چھین لیے جاتے ہیں۔ ایک روز آنے گا جب نتیجے کا اعلان ہو گا۔ اس روز امتحان گاہِ دنیا کی یہ مخلوط آبادی دو حصّوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ کامیاب ہونے والے ایک طرف آباد کر دیئے جائیں گے اور ان میں

ناخدا ترسی اور حق سے بے وفائی کرنے والا کوئی نہ ہوگا اور دوسری طرف فیل ہونے والے آباد کر دیے جائیں اور ان میں غدا ترسی اور حق سے وفاداری کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔
میرے اس شعور نے انسانوں کی اتنی تلخ و شیریں اقسام کے بارے میں میرا عقدہ حل کر دیا اور میں نے انسان کو شناخت کر لیا۔

---

۳ ــــ انسان کے بعد میرا مشاہدہ مسلمان کے بارے میں بہت پریشان کن ہے۔ میں نے جو مسلمان کتابوں میں پڑھا، تاریخ اسلام میں دیکھا، صحابہ کرام کے درمیان پایا۔ جنگ بدر، جنگ اُحد اور معرکہ ہائے حنین و بیت المقدس میں دیکھا اور جس کے اوصاف قرآن و حدیث میں موجود پائے وہ مسلمان دوسری قسم کا ہے۔ اور جو مسلمان میں نے اپنے چاروں طرف موجود پایا وہ دوسرا ہے۔ ان دونوں کے درمیان لامتناہی فاصلہ ہے۔ یہ فاصلہ حیرت انگیز بلکہ وحشت انگیز ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کے بارے میں میرا مشاہدہ انتہائی لاینحل تضاد پر مشتمل ہے۔ کتاب تاریخ کے مسلمان اور حقیقتِ نفس الامری کے مسلمان میں صدیوں کا فاصلہ بھی ہے، اور منزلوں کا فاصلہ بھی۔ لائبریری کی کتابوں میں جو مسلمان ہے وہ فاتح ہے، متوکل ہے، ایمان دار اور بہادر ہے۔ لیکن پرانی تاریخ اور جدید جغرافیے کے مسلمان کے تضاد نے مجھے حیرت زدہ کر دیا ہے۔ آخر کتابی مسلمان اور موجودہ مسلمان میں اتنا فاصلہ کیوں ہے؟ یہ فاصلہ کیسے واقع ہو گیا ہے؟ کیا یہ مسلمان اپنی اس مسلمانی کے ساتھ وہ نتائج پیدا کر سکتا ہے جو دورِ اوّل کے مسلمان نے اپنی دورِ اوّل کی مسلمانی کے ساتھ پیدا کیے تھے؟ اس سوال کا جواب مسلمان کے سوا ساری دنیا کو معلوم ہے۔
میں نے جب ولیم ہنٹر کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" پڑھی جس میں اس نے بنگال، بہار کے مسلمانوں میں بار بار بغاوت کے اسباب کا تجزیہ کیا ہے کہ آخر وہ کیوں برٹش حکومت سے بار بار بغاوت کر کے سرحد پار مجاہدین کے ساتھ مل کر جہاد کرتے ہیں تو اس کافر کی یہ دریافت سامنے آتی ہے کہ مسلمان اپنے عقیدے کی رو سے غیر...

قوانین کے تحت زندہ رہنے کو غیر اسلامی زندگی سمجھتا ہے اس لیے وہ مسلمان رہنے کے لیے اور اسلامی زندگی بسر کرنے کے لیے جہاد پر مجبور ہے۔ اس کافر کی اس حقیقت شناسی پر میں حیران رہ گیا کہ غیر مسلموں کی نظر میں تو مسلمان غیر اسلامی زندگی پر مجبور کیا جائے تو وہ جہاد کر کے اسلامی زندگی بسر کرنے کا سامان کرتا ہے لیکن آج کے مسلمانوں کو تو ایسا کوئی عقیدہ مجبور نہیں کرتا ہے وہ غیر اللہ کی غلامی کرنے کے لیے ہر عقیدے کی پابندی سے آزاد ہیں۔

---

۴ ـــ زندگی میں میرا مشاہدہ اپنے مسلمان معاشرے کے بارے میں بھی افسوسناک تلخیوں پر مشتمل ہے۔ دورِ اوّل کا مسلمان معاشرہ تو ایسا تھا کہ اس کے مجرم بھی خود حاضر ہو کر جرم کا اعتراف کر کے سزا کا مطالبہ کرتے تھے تاکہ انھیں سزا دے کر اضطراب گناہ سے پاک کر دیا جائے اور وہ خدا کے سامنے اس جرم کے ساتھ حاضر نہ ہوں۔ اس کے تاجر اگر تجارت کی خاطر کبھی دوسرے ملک میں چلے جاتے تو ان کی دیانت، امانت، راست گفتاری انصاف اور اخلاق کو دیکھ کر غیر مسلم مسلمان ہو جاتے تھے۔ چنانچہ مشرق بعید کے بیشتر ممالک انھی تاجروں کے اخلاق و کردار نے فتح کیے۔ اس کے حکام عوام میں انصاف و عدل کی تقسیم کرنے کے لیے ان کے دروازوں تک پہنچتے تھے۔ ان کے علماء حق کی خاطر شاہی وظائف کو ٹھکرا کر کوڑے کھانا لیکن حق کی گواہی دینا پسند کرتے تھے۔ ان کے امراء اپنی دولت مسلمانوں کی خدمت اور اسلام کی اشاعت کے لیے جھولیوں میں لیے پھرتے تھے، لیکن مسلمان معاشرے میں اب یہ جنس نایاب ہے۔

---

۵ ـــ میرا مشاہدہ اپنی مسلمان ملت کی ماہیتِ قلب پر بھی حیرت زدہ ہے۔ یہ ملت جب وجود میں آئی تو اس کے اصولی اور نظریاتی احساس کا عالم یہ تھا کہ اس نے معرکۂ بدر میں اپنے خون کے رشتوں کو اپنے نظریات کی تلوار سے کاٹا۔ اپنے نظریات کے لیے چند سو کی تعداد میں ہوتے ہوئے ہزاروں اور لاکھوں کے لشکر سے ٹکرا لیے۔ اصولوں کی خاطر

اپنے آبائی گھروں کو، قیمتی کاروباروں کو اور پیارے وطن کو چھوڑا۔ پیٹ پہ پتھر باندھ کر بھی اپنے نظریات عقائد اور اصولوں کی حفاظت کی اور دنیا میں ایک ایسی نظریاتی مملکت قائم کی جو خدا کی بادشاہت، رسول اکرمؐ کی قیادت، قرآن کی دستوری حکومت، اہل علم کی جمہوری مشاورت، عدل و انصاف اور اخوت و مساوات کی معاشرت پہ قائم تھی۔ لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت امیر معاویہ کے ایک تنازع نے اسے ایسا بے حس کیا کہ اس کے سامنے خلافت کا قیمتی ادارہ تباہ ہو گیا تو یہ خاموش رہی۔ حضرت امام حسینؓ کو ذبح کر دیا گیا تو دیکھتی رہی۔ امام مالکؒ کو مدینے کی گلیوں میں رسوا کیا گیا تو اس نے دم نہ مارا۔ امام احمد بن حنبلؒ کو ۲۰ سال تک کوڑے پڑتے رہے تو اس کے عوام نے ایک مظاہرہ اور اس کے تاجروں نے ایک ہڑتال تک نہ کی۔ امام ابوحنیفہؒ کا جنازہ عباسیوں کے ظلم و ستم کا شکار ہو کر جیل سے نکلا تو ان کے ماننے والے لاکھوں کی تعداد میں انہیں قبرستان تک پہنچا کر چپ چاپ گھروں میں بیٹھ گئے۔ جو ظلم اس ملت پر ہو گیا اس نے سہا۔ جو رسوائی و ذلت اسے دی گئی اس نے برداشت کر لی۔ خدا کی پناہ، غیرت و حمیت کے مقابلے میں اتنی سنگین برداشت اس میں کہاں سے آئی۔

دنیا کے چوراہے پر ہر احساس سے محروم یہ ملت صدیوں سے بے حس و حرکت پڑی ہے۔ اسے اپنے با اصول نظریاتی وجود کا احساس کب ہو گا؟ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ میرا یہ المناک مشاہدہ مجھے پہروں رنجیدہ رکھتا ہے۔

---

۶ — میرا مشاہدہ اپنے ملک پاکستان کے بارے میں بھی ایسی ہی تلخیوں پہ مشتمل ہے ہم نے تقسیم ملک سے پہلے جن عزائم کا اظہار کیا اور جو وعدے دنیا بھر کو گواہ کر کے دنیا کے سامنے کیے۔ اپنی جداگانہ قومیت کے اثبات کے لیے اپنے دین اسلام کے حوالے سے جو جو دلائل دیئے اس سے معلوم ہوتا تھا کہ ہم خالص ایک اسلامی نظریاتی مملکت اسلام کے آفاقی اصولوں پر مبنی قائم کرنے جا رہے ہیں۔ پھر جو وعدے ہم نے عوام الناس سے کیے اور ان سے تاریخ کی عظیم الشان قربانیاں طلب کیں وہ بھی ہماری تاریخ کا حصہ

ہیں لیکن جس طرح ہم نے پاکستان پہنچ کر اپنے وعدوں کو پامال اور اپنے دعووں کو باطل کیا ہے یہ بھی بنی اسرائیل کو چھوڑ کر قوموں کی تاریخ میں وعدہ شکنی کا ایک خصوصی ریکارڈ ہے جس کی بنا پر ہم قوموں کے درمیان عزت کا مقام نہیں پا سکتے۔ چنانچہ آج ہمارا مقام قوموں کی برادری میں عزت کا مقام نہیں ہے۔

---

۷ ۔۔۔ اپنے ملک میں مذہبی فرقہ بندی کا مشاہدہ بھی میرے لیے شدید ذہنی اذیت کا حامل رہا ہے۔ اپنے بچپن اور جوانی میں جب ہم ایک غیر مسلم قوم کے غلام تھے اس وقت بھی یہ مذہبی فرقہ بندی اس درجہ اشتعال انگیز حد تک بڑھی ہوئی نہیں تھی، جو آج ہے۔ آخر ہماری اس فرقہ بندی پہ کفار کے سوا اور کون خوش ہو سکتا ہے۔ جو ملتِ خدا اور رسولؐ کی طرف سے تمام تر اتحاد کی بنیادوں پر ہی استوار کی گئی ہو۔ توحید، رسالت، آخرت، قرآن، حساب کتاب، دوزخ، جنت، حلال و حرام، گناہ و ثواب، معروف و منکر، اخوت و دیانت، آخر کس چیز میں اختلاف ہے۔ ساری ہی متفق علیہ بنیادیں ہیں۔ ترجیح و عدم ترجیح اور فضیلت و عدم فضیلت، سے انسان کے اسلام میں تو کوئی فرق نہیں آتا۔ ایمان بھی زائل نہیں ہوتا۔ اور خدا کے ہاں فقہی مسائل کی بازپرس بھی نہیں ہے۔ پھر ترجیح و فضیلت کے ان علمی مسائل کو عوام الناس کے سامنے پیش کرنا جو علمی سطح پر فیصلے کی کوئی صلاحیت نہیں رکھتے سراسر ایک غیر علمی روش ہے جو اسلام اور عوام کے ساتھ زیادتی ہے۔ یہ بات اہلِ علم کو زیب نہیں دیتی علمی راستہ چھوڑ کر عوام کو حَکَم بنانے کے نتیجے میں اُمتِ محمدیہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ کیا حضورؐ اکرم اس صورتِ حال کو پسند فرما سکتے ہیں۔ اگر نہیں تو پھر حبِ رسولؐ کا تقاضا اتحادِ ملت میں ہے افتراقِ ملت میں نہیں ہے۔ لیکن اتحادِ ملت کے دعووں کے ساتھ افتراقِ ملت ہی میں ہر روز اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

---

۸ ۔۔۔ مسلمان کے اندر موجودہ سیاسی جماعتوں کا کردار بھی میرے مشاہدے کا ایک المیہ ہے۔ باہمی ایک دوسرے کی کردار کشی، الزام تراشی، بہتان بازی جھوٹ اور افترا کی فراوانی کو لوگوں نے سیاست کا نام دے لیا ہے۔ اس درجہ کی گھناؤنی سیاست جو بہتان تراشی کو

مسلم معاشرے میں فروغ دے شاید مغربی معاشروں میں بھی رائج نہ ہوگی۔ لیکن اگر ان میں رائج ہو بھی تو وہ ہم مسلمانوں کے لیے تو ہرگز واجب الاتباع نہیں ہے۔ اقتدار کی ہوس جسے اسلام نے مکروہ قرار دیا ہے وہ ہمارے ہاں کی سیاسی جماعتوں میں اس درجہ سرایت کر گئی ہے اور ان کا کردار اِس درجہ ملت کے لیے افتراق انگیز بن گیا ہے کہ ان میں غیر مسلم قوموں کا آلۂ کار تک بن جانے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے۔ یہ صورتِ حال اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ ان جماعتوں کو از سرِ نو اسلام کے اجتماعی اُصولوں پر منظم کیا جائے۔ اس صورت میں یہ جماعتیں ایک مسلمان معاشرے کی اصلاح میں مددگار ثابت ہوسکتی ہیں۔

۹۔ مسلمانوں کی سیاسی اور اجتماعی زندگی کا ہر سطح پر ایک نہایت درجہ مکروہ پہلو باہمی ایک دوسرے کی "ٹانگ کھینچنا" بھی ہے۔ یہ عادت ہماری اسلامی تعلیمات میں بالکل اجنبی ہے لیکن ہماری اجتماعی اور سیاسی زندگی میں بے رحمی کی حد تک معمول بن گئی ہے۔ لوگ اس معاملے میں کسی کو بھی معاف نہیں کرتے۔ ایک کو گرانے اور دوسرے کو آگے بڑھانے کا کھیل بالکل شطرنج کے مہروں کی طرح کھیلا جاتا ہے۔ اس کے سبب کتنے ہی لوگ دل شکستہ ہو کر اجتماعی زندگی میں کوئی قابلِ ذکر کردار ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ جو لوگ غلط طریقوں سے دھڑے اور گروپ بنا کر اجتماعی زندگی میں چلتے ہیں وہ اس گروپ کے سہارے چلتے رہتے ہیں اور آگے بڑھتے رہتے ہیں، لیکن جو لوگ صرف خلوص، محنت اور جذبۂ خدمتِ ملی کے زور سے چلتے ہیں، کسی نہ کسی مرحلے پر کوئی نہ کوئی ان کی ٹانگ کھینچ کر گڑھے میں پھینک دیتا ہے اور یہ عمل سیاست کے حوالے سے اتنی بے دردی کے ساتھ ہوتا ہے کہ کردار کشی کے ذریعہ اس کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیرنے کی کوشش بھی ساتھ ساتھ کی جاتی ہے تاکہ کوئی اس سے ہمدردی بھی نہ کرنے پائے۔ سیاسی زندگی میں اس ظالمانہ کارروائی کا شکار مخلص لیکن بے سہارا کارکن ہمیں ہر پارٹی میں دکھائی دیں گے۔ یہ عمل ملازمتوں میں بھی اب زور و شور سے جاری ہے۔ یہ ہماری اجتماعی زندگی کا انتہائی بھیانک عمل ہے۔

(باقی)

مادہ پرستانہ سائنس کی گواہی

تعلیماتِ قرآن کی صداقت پر

مرتبہ: زُہیر کاشمیری - مترجم: عبد الہادی (ادارۂ معارفِ اسلامی)

نوٹ:- اتفاق سے دو تحریریں ایسی سامنے آئی ہیں کہ مغرب کے مادہ پرستانہ سائنسی نقطۂ نظر کے خلاف ماہرین نے قرآن کی تعلیمات کی تصدیق کی۔ ان میں سے نمبر (۱) پیش کی جارہی ہے (۲) انشاء اللہ اگلی اشاعت میں۔ (ادارہ)

(۱)

یہ دو برس پہلے کی بات ہے۔ ٹورنٹو یونیورسٹی کے ایک ماہر جنینیات (EMBRYOLOGIST) ایک غیر معمولی سائنسی مشن پر سعودی عرب گئے۔ ان سے قرآن کی چند آیات کی تشریح میں مدد چاہی گئی تھی۔

یہ ڈاکٹر کیتھ مُور تھے۔ اُدھر اوّلین ٹسٹ ٹیوب بچے کی پیدائش کے محقق ڈاکٹر رابرٹ ایڈورڈز نے بھی ان کی توضیحات کی تصدیق کردی تھی۔ یوں ان دونوں سائنسدانوں نے مسلم علماء کو آیاتِ قرآنی کے بارے میں اپنی دریافت سے دنگ کردیا تھا۔ وہی قرآن جسے مسلمان تیرہ سو برس سے حفظ اور تلاوت کرتے چلے آرہے ہیں۔

جو انہوں نے دریافت کیا، وہ یہ تھا کہ قرآن میں انسانی جنین کا جو نظریہ بیان کیا گیا ہے، وہ اب ایک ناقابلِ تردید سائنسی صداقت بن کر سامنے آیا ہے اور یہ کہ مغربی محققین پر اس حقیقت کا انکشاف ۱۹۴۰ء میں ہوا۔ اس ضمن میں زیادہ تر معلومات تو محض گذشتہ پندرہ برس میں سامنے آئی ہیں۔

ڈاکٹر کیتھ مور ٹورنٹو یونیورسٹی کے شعبۂ تشریح الاعضاء کے چیئرمین ہیں۔ تخلیقِ انسانی سے بحث کرنے والی آیاتِ قرآنی پر اپنا خصوصی مقالہ پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"مجھے اس بات نے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ جب مجھے یہ پتہ چلا کہ قرآن نے ساتویں صدی عیسوی میں جو حقائق پیش کیے، وہ کس قدر درست اور سائنسی صداقتوں کے حامل ہیں"۔

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قرآن ساتویں صدی عیسوی میں خدا کی طرف سے اپنے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اُتارا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے دُنیا کے سامنے اسلام پیش کیا۔ آج اسلام عیسائیت کے بعد دوسرا بڑا مذہب ہے۔ یاد رہے کہ ڈاکٹر مور یونائیٹڈ چرچ کے ممبر اور ایک بڑے پادری کے بیٹے ہیں۔ وہ اپنے عقیدے پر مطمئن ہیں اور ایک ملاقات میں بتا چکے ہیں کہ اسلام قبول کرنے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں۔ ڈاکٹر مور کہتے ہیں کہ میں نے بائیبل کے عہدنامہ قدیم اور جدید کا تجزیہ بھی کیا، لیکن قرآنی آیات سے اُن کی کوئی مماثلت نظر نہ آئی۔ جنینیات پر اُن کی دو تصنیفات معیاری درسی کتب کا درجہ رکھتی ہیں۔ اور دُنیا کی کئی زبانوں میں ان کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر مور کہتے ہیں کہ جنین کے ابتدائی ۲۸ روز میں نمو کے متعلق قرآنی آیات نے جو حقائق بیان کیے ہیں، وہ اتنے صحیح ہیں کہ انسانی عقل کو تعجب میں ڈال دیتے ہیں۔ ڈاکٹر مور کو یقین ہے کہ:-

"قرآن کی آیات اور پیغمبر اسلام کے کچھ فرامین مذہب اور سائنس کے درمیان مدتوں سے حائل خلیج کو پاٹنے میں مدد کر سکتے ہیں"۔

جب ان سے پوچھا گیا، کہیں ایسا تو نہیں کہ خام چیر پھاڑ کے نتیجے میں یہ معلومات سامنے آگئی ہوں؟ تو انھوں نے کہا۔ اس مرحلے پر جنین کی جسامت ایک ملی میٹر کے دسویں حصے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ انسانی آنکھ کو ایک چھوٹے سے نقطے کی شکل میں نظر آتا ہے۔ اس کی شناخت ایک طاقت ور خوردبین کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ اور یہ بات اپنی جگہ تسلیم شدہ ہے کہ سترھویں صدی عیسوی سے پہلے خوردبین کی ایجاد نہ ہوئی تھی۔

دو برس پہلے ڈاکٹر کیتھ مور کو جدہ کی شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی نے مدعو کیا تھا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر رابرٹ ایڈورڈز کو بھی بلایا گیا۔ یہ وہی ڈاکٹر رابرٹ ہیں کہ جن کے کیمرج یونیورسٹی میں کیے گئے تجربات کی بدولت پہلے ٹیسٹ ٹیوب بچے کی پیدائش عمل میں آئی۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر ٹی وی این پرساد اور ڈاکٹر مارشل جانسن بھی مدعوئین میں شامل تھے۔

ڈاکٹر مور کہتے ہیں، اس موقع پر منعقدہ کانفرنس کے علماء نے ان چاروں ماہرین کو قرآن کی متعدد آیات کے انگریزی تراجم پیش کیے۔ اور ان سے رائے مانگی کہ آیا ان کی کوئی سائنسی تعبیر ہوسکتی ہے؟ ایک آیت جو پیش کی گئی یہ تھی۔

"وہ تمھیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر تمھیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے" (الزمر - ۶)

ڈاکٹر مور کہتے ہیں۔ ان تین تاریکیوں سے مراد، پیٹ کی دیوار، رحم مادر کا پردہ اور بچے دانی کی اندرونی جھلی ہے۔ ایک دوسری آیت میں بتایا گیا ہے کہ بعد میں بوند کو خون کے لوتھڑے "مضغة" میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ عربی میں مضغہ کا لفظ جونک کے لیے آیا ہے۔

ڈاکٹر مور اور دوسرے ماہرین کا خیال ہے کہ عرب میں پائی جانے والی جونک اور ۲۴ دن کے جنین میں حیرت انگیز مشابہت پائی جاتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس مرحلے پر جنین رحم کی دیوار سے جونک کی طرح لپٹ جاتا ہے۔

آگے کی ایک آیت کہتی ہے کہ یہ جونک نما نقطہ بعد میں چبائی ہوئی چیز کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس مرحلے پر جنین کی شکل کی وضاحت کرنے کے لیے ڈاکٹر مور نے پلاسٹک کی ایک چھوٹی سی چیز تیار کی اور پھر اُسے اپنے دانتوں سے چبایا۔ پھر بتایا کہ ۲۸ روز کے جنین کی شکل ہو بہو ایسی ہوتی ہے اور اس پر جو نشانات پائے جاتے ہیں وہ بھی دانتوں کے نشانات سے مماثل ہوتے ہیں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلے پر جسم کے چند ہی اعضا کی شناخت ہوسکتی ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ صرف دل اور آنکھوں کے عدسے کی پہچان ممکن ہوتی ہے۔

ڈاکٹر مور نے کہا کہ آیات قرآنی کہتی ہیں کہ تیزی سے نکلنے والے مادۂ منویہ

کے ایک انتہائی مختصر حصے میں بار آور کرنے کی صلاحیت رکھنے والا عنصر پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر مور نے اپنے مقالے میں بتایا کہ جس حقیقت کی نشاندہی سپیلن زینی نے اٹھارھویں صدی عیسوی میں کی، جب اس نے تجرباتی طریقے سے ثابت کیا کہ جب تک نر اور مادہ کے جنسی تولیدی عناصر کی باہم آمیزش نہ ہو، حیاتیاتی نمو نہیں ہو سکتی۔ قرآن نے اس سے گیارہ صدیاں پہلے "مخلوط قطرے" کی نشاندہی کر دی اور بتا دیا تھا کہ مرد اور عورت کے نطفوں کے باہمی ملاپ سے انسان کی تخلیق ہوتی ہے۔

ایک آیت مادۂ تولید کی نقطے کی طرح مہین (جسے عربی میں نطفہ کہا جاتا ہے) مقدار سے بحث کرتی ہے کہ کس طرح اس حقیر بوند میں ایک وسیع تر تخلیقی منصوبہ پنہاں اور جامع نقشہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ یہ بوند مستقبل کے سارے کرداروں اور خصوصیات کو اپنے وجود میں سمونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

پیغمبر اسلام کے جمع کردہ جن فرامین کا ڈاکٹر مور نے مشاہدہ کیا، ان میں سے ایک میں کہا گیا ہے کہ حمل ٹھہرنے سے ۴۲ روز بعد خدا ایک فرشتے کو بھیجتا ہے جو نطفے کی طرح شے کو انسانی اعضا اور شکل دیتا ہے جیسے آنکھیں اور کان۔

جنینیاتی تحقیق نے ثابت کر دیا کہ آنکھیں اور کان ٹھیک ۴۲ روز کے بعد واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بقول فرشتہ ہر بار خدا سے پوچھتا ہے:

"خدایا (کیا یہ) مرد ہے یا عورت؟"

ڈاکٹر مور کہتے ہیں: یہی بات جدید تحقیق نے ثابت کی ہے کہ بارہ ہفتے تک جنس کے بارے میں پتہ نہیں چلایا جا سکتا۔ ڈاکٹر مور اپنے تجزیے کے بعد اس حاصل مطالعہ نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

"اگر مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ آیاتِ قرآنی خدا کی نازل کردہ ہیں تو اس عقیدے کی معقول بنیاد ہے۔ شاید سب سے اہم بات ان کا حاملِ صداقت ہونا ہے"۔

مطبوعات

سائنس کی دینیات مرتبہ: منظفر حسین صاحب ڈائریکٹر محکمہ زراعت پنجاب (لاہور)
ناشر: پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس۔ ۷ فرینڈز کالونی، ملتان روڈ، لاہور۔
صفحات: سوا دو سو۔ کاغذ اچھا۔ طباعت مناسب، سرورق بے اثر۔
قیمت: -/۲۰ روپے

ہمارے ہاں ایک اہم مبحث یہ چلا آ رہا ہے کہ سائنس کے متعلق اسلام کا رویّہ کیا ہے۔ اور موجودہ مادہ پرستانہ سائنس میں کس پہلو سے کجی و کوتاہی پائی جاتی ہے۔ مگر اس مبحث پر کچھ زیادہ کام نہیں ہوا۔ اور جو ہوا اس میں سے بہت کم حصہ وقیع ہے۔ پیشِ نظر کتاب فکری پیش قدمی کی آئینہ دار ہے۔ اوّل تو اس کا نام ہی خاصا انقلابی ہے اور پھر اندر کے جمع شدہ مقالات کو پڑھ کر ذہن کے سامنے سوچنے کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ زیادہ جگہ نہیں، اس لیے اس کا خلاصہ میں یوں بیان کرتا ہوں کہ سائنسی اور فلسفیانہ ذرائع سے جو حقیقتیں ہمارے سامنے آشکارا ہوتی ہیں اُن سب کو ایک حقیقتِ عظمیٰ کے گرد جمع ہونا چاہیے اور اس سے مطابقت پیدا کرنی چاہیے، ورنہ جب تک انسانی ذہن اور عمل اور اجتماعیت کی تقسیم جاری رہے گی ایک لاینحل خلا موجود رہے گا۔ ڈاکٹر زیڈ اے ہاشمی کا مقالہ "نکتۂ توحید" اور "اسلام اور سائنس" اور "خرد کی نامسلمانی سے فریاد" از ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم سائنس کے متعلق اسلام کے توحیدی شعور کو خوب واضح کر دیتے ہیں۔ رہی سہی کسر منظفر حسین صاحب نے اپنے چار مقالات سے پوری کر دی ہے۔ جن میں ایک طرف قرآن و حدیث سے استدلال کیا گیا ہے اور دوسری

طرف جدید سائنس دانوں اور مغربی مفکرین کے دلچسپ واقعات اور حوالے سامنے لائے گئے ہیں۔

یہ کتاب خوب پڑھی جانی چاہیے، بلکہ کسی مناسب سطح کی نصابی کتب میں شامل کی جانی چاہیے۔

اعجازِ بیان مجموعہ کلام: پروفیسر اسرار احمد خان سیوہاروی۔ ناشر: ادارۂ آئینۂ ایام، ۵، ۱۷ سی، سٹیلائیٹ ٹاؤن، گوجرانوالہ۔ صفحات: ۲۵۶۔ قیمت درج نہیں۔

پروفیسر اسرار احمد خان فکر و فن میں ہمارے دیرینہ رفیق ہیں اور اسلامی ادب کی صفِ اوّل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ تو اچھا ہوا کہ باوجود علالت اور کمزوری کے انھوں نے اپنا مجموعہ مرتب کر کے شائع کرا دیا، مگر کاش کہ وہ ایسی شان سے شائع ہوتا جیسے پروفیسر صاحب کا مقام ہے۔ ترجمان القرآن میں (خصوصاً اس شمارے میں) نمونۂ کلام پیش کرنا تو مشکل ہے، البتہ ان کے نظریۂ شعر و ادب کی ایک جھلک دکھائی جا سکتی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

— "میں اخلاق میں اضافیت کا قائل نہیں ہوں، اخلاقی قدریں پائیدار اور مستقل ہوتی ہیں"۔ (ص ۴)

— "ادب دراصل صورتِ احساس کی نقش گری کا نام ہے"۔ (ص ۱۱)

— "ادب ہماری زندگی کے ایک ایک گوشے میں جھانکتا ہے"۔ (ص ۱۲)

— "دیکھنے کی بات صرف یہ رہ جاتی ہے کہ مقصد بھلا ہے یا بُرا، اور یہ کہ مقصد کو کس ڈھنگ سے سمویا گیا ہے"۔ (ص ۱۴، ۱۵)

— "ایک قابلِ قدر تخریر ہمیشہ زندگی میں سے اسی طرح پھوٹ کر باہر نکلتی ہے، جس طرح کہ کسی پودے میں سے کوئی نئی کونپل پھوٹ کر ظاہر ہو"۔ (ص ۲۰)

— " اسلامی ادب کی اگر وسیع تعریف کریں تو ہر وہ ادب اس میں شامل ہے جس میں اسلام کی عطا کردہ اخلاقی قدروں کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہو۔" (ص ۴۸)

پورا مقدمہ بڑا مبسوط ہے۔

حمدیں اور نعتیں دونوں خاصی تعداد میں زینتِ آغاز ہیں۔ پھر نظمیں اور آخر میں غزلیں ہیں۔ ہم پُر خلوص جذبات کے ساتھ اعجازِ بیان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

صحیفۂ ہمام ابن منبہ از ڈاکٹر حمید اللہ (مقیم پیرس) ناشر: ملک سنز، کارخانہ بازار فیصل آباد - پاکستان - تازہ ایڈیشن - صفحات: ۱۴۶ - قیمت: ۱۵/- روپے

اس کتاب کے اولین ایڈیشن پر ترجمان القرآن میں تبصرہ شائع ہو چکا ہے۔ یہ ۵۸ھ سے قبل کی تالیف ہے۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ یہ حضرت ابوہریرہؓ کے ایک شاگرد ہمام کے پیش کردہ مجموعہ پر مشتمل ہے جس کا تذکرہ مع اقتباسات کتبِ احادیث میں موجود ہے مسند احمدؒ بن حنبل میں پورا مجموعہ شامل ہے۔ اسے ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے برآمد کر کے شائع کیا ہے حضرت ابوہریرہؓ چار سال تک سفر و حضر میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ اس عرصے میں حضرت ابوہریرہؓ نے جو کچھ حضورؐ سے سنا اور دیکھا اُسے محفوظ رکھا اور پھر اس خزانۂ جواہر کو درس کے ذریعے عام کرتے رہے۔ آپ سے ۵۳۷۴ احادیث مروی ہیں۔ ان میں سے ۴۴۶ احادیث صحیح بخاری میں شامل ہیں۔ ان کے شاگرد ہمام ابن منبہ نے اُن کی جمع کردہ احادیث ان سے سیکھیں اور ان کو مسلسل آگے منتقل کرتے رہے۔ اس طرح حضرت ابوہریرہؓ کی روایات کا مجموعہ محفوظ رہا جس کا نام "الصحیفۃ الصحیحہ" تھا۔ اس مجموعے (اور بعض دوسرے مجموعے) کا وجود منکرینِ حدیث کے اس اعتراض کا مسکت رد ہے کہ حدیثیں بہت بعد میں مرتب ہوئیں بلکہ وہ کہتے ہیں کہ گھڑی گئیں۔

اس کا مقدمہ جناب پروفیسر غلام احمد حریری نے لکھا ہے۔

مکتوباتِ مودودیؒ بنام مولینا محمد چراغ مدظلہ

مرتب: جناب عبدالغنی عثمان، ایم۔ اے، بی۔ اَیڈ۔
ناشر: انصاری پبلشرز۔ فیصل آباد۔
تقسیم کنندہ: مکتبۂ افکارِ اسلامی، کچہری بازار۔ فیصل آباد۔ سفید کاغذ پر مناسب طباعت اور سادہ مگر اچھا سرورق۔ صفحات: ۸۰ قیمت: -/۱۰ روپے

واجب الاحترام مولینا محمد چراغ صدر مدرس، مدرسہ عربیہ گوجرانوالہ، بزرگ علما میں سے ممتاز شخصیت ہیں۔ انہوں نے یہ روشن مثال قائم کی کہ حق کی آواز سنی تو "دیوبندیت" کے گروہی حصار کو توڑ کر اس کی طرف لپکے۔ وہ تحریک اسلامی کی پُرخلوص محبت اور اس کے متوسلین کے ساتھ شفقتِ خاص رکھتے ہیں۔ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے ان کا اوّل روز سے گہرا تعلق قائم ہوگیا۔ اس کے بعد انہیں جس بھی مسئلے میں مولینا سے اختلاف ہوا اس پر انہوں نے خط و کتابت کی اور بلا تکلف انہوں نے اپنا ہر اشکال پیش کر دیا۔ مولینا مودودیؒ مرحوم بھی الاستاذ مولینا محمد چراغ صاحب کے خطوط اور سوالات و اشکالات کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ اس پس منظر کے ساتھ اس مجموعۂ خطوط کی اہمیت ظاہر ہے جس میں ۳۶ غیر مطبوعہ و مطبوعہ خطوط شامل ہیں۔

دیباچہ مرتبِ مجموعہ عبدالغنی صاحب کا لکھا ہے اور مقدمہ حضرت مفتی سیّد سیاح الدین صاحب کاکاخیل کا ہے۔

سب سے بڑا انسان

مؤلف: سیّد نظر زیدی رفیق ادارۂ معارف اسلامی، لاہور۔
ناشر: اسلامک بک پبلشرز پوسٹ بکس نمبر ۲۰۲۱۰، الصفات، الکویت۔
اچھا کاغذ، اچھی طباعت، اچھا سرورق۔ صفحات: ۲۹۶، قیمت: -/۳۰ روپے
لاہور میں اسٹاکسٹ: المنار بک سنٹر، منصورہ، لاہور ۱۸

ہمارے دوست اور پرانے ہم قلم سیّد نظر زیدی اپنی دوسری صلاحیتوں کے ساتھ

یہ ملکہ بھی رکھتے ہیں کہ بچوں کے لیے آسان زبان میں تعمیری مواد پیش کر سکتے ہیں۔ اس مرتبہ اُنھوں نے بہت بڑا کام کیا ہے کہ بچوں کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت آسان زبان اور دلچسپ پیرائے میں لکھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ بڑی حد تک اس میں کامیاب رہے ہیں۔ اس کتاب کو والدین اپنے بچوں کے لیے ضرور خریدیں اور مدارس کی لائبریریوں میں بھی اس کو پہنچنا چاہیے۔ بلکہ کیا ہی اچھا ہو کہ ساتویں درجے سے دسویں درجے تک کے طلبہ کے لیے اسے نصابی کتب میں شامل کیا جائے۔

BANGSAMORO | انگریزی میں تالیف: صلاح جبیر

ناشر: ادارۂ معارف اسلامی۔ منصورہ، لاہور ۱۸۔ معیار طباعت مناسب۔ ٹائٹل خوشنما، صفحات: ۱۶۰، قیمت: ۴۰/- روپے۔

انتہائی اختصار کے ساتھ اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ فلپائنی مسلمانوں کو آج زندگی و موت کی جس کشمکش کا سامنا ہے، اُسے سمجھنے کے لیے پہلی بار پاکستان میں ایسی جامع کتاب شائع ہوئی ہے۔ فلپائن کا جغرافیہ، اس کی تاریخ، اس پر استعماریت کا سایۂ بد، مسلم آبادی کا جنوبی حصہ، داستانِ آزادی اور مسلمانوں کے ساتھ فریب، مسلمانوں پر ہو رہے مظالم، پھر مسلمانوں کی جوابی تحریکِ بقاء۔ اِن سارے احوال کو اس کتاب میں خوبی سے بیان کر دیا گیا ہے۔ عالمی ملت اسلامیہ سے وارفتگیٔ دل رکھنے والوں کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ خصوصاً صحافیوں، مصنفین، اساتذہ اور سیاسی حضرات کو۔
